تصحیح واضافہ شدہ جدید ایڈیشن

مسائل ودلائل کا دلچسپ مجموعہ

دورۂ حدیث اور مشکوٰۃ شریف کے طلبہ و طالبات کے لئے بیش بہا تحفہ

اختلاف الائمۃ فی المسائل المھمۃ

عنوانات بترتیب بخاری و ترمذی شریف

تالیف

مولانا عبدالغفور سنبھلی

فاضل دارالعلوم دیوبند

تصحیح و ترتیب جدید مع اضافہ

مفتی فیضان الرحمٰن کمال

استاذ مدرسہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

شاخ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی



اسلامی کتب خانہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فون: 021-34927159

تصحیح واضافہ شدہ جدید ایڈیشن

مسائل و دلائل کا دلچسپ مجموعہ

دورۂ حدیث اور مشکوٰۃ شریف کے طلبہ و طالبات کے لئے بیش بہا تحفہ

اختلاف الائمۃ فی المسائل المہمۃ

عنوانات بترتیب بخاری و ترمذی شریف

تالیف
مولانا عبدالغفور سنبھلی
فاضل دارالعلوم دیوبند

تصحیح و ترتیب جدید مع اضافہ
مفتی فیضان الرحمٰن کمال
استاذ مدرسہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
شاخ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
فون: 021-34927159

فہرست

تقریظ

ادیبِ دوراں خطیبِ زماں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی

استاذ ادب وفقہ دارالعلوم دیوبند

حامدًا و مصلیًا و مسلمًا و بعد.....!

چمنستانِ قاسمی میں نونہالانِ چمن کی برابر سنچائی ہورہی ہے۔ ماشاء اللہ اس کی پُر رونق بہار میں رنگارنگ پھول کھلتے رہتے ہیں جن کی مہک طرح طرح سے ملّت کے مشامِ جاں کو معطر کرتی رہتی ہے، اور اُن کے گلدستے مجلس کو زعفران زار بنادیتے ہیں۔ اسی کی ایک لڑی یہ مجموعہ ''اختلاف الائمہ فی المسائل المہمہ'' ہے جس کو مادرِ علمی کے ایک ہونہار طالب علم عزیزم عبدالغفور سلمہٗ نے تیار کیا ہے، یہ امسال دورۂ حدیث شریف میں شامل ہیں۔ شوقین اور محنتی طالب علم ہیں، سبق میں حاضر باشی کے ساتھ مطالعہ وتکراران کا شغف ہے۔ درسِ حدیث میں اساتذۂ کرام کے غنچہ دہن نے جو پھول برسائے، آں عزیز نے اس کتاب میں ان کو یکجا کردیا ہے، ایمان کی بحث سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے، طہارت ونماز وغیرہ سے متعلق مباحث بھی اس میں آگئے ہیں۔

مختصر طور پر احادیث کی تشریحِ مسائل میں ائمہ کرام کا اختلاف معہ دلائل وجوابات اور حوالہ جات ہیں۔ گویا اساتذۂ کرام کی تقاریر کا نچوڑ پیش کردیا ہے جو حدیث شریف کے طلبہ کے لئے ایک گراں بہا تحفہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیتِ تامّہ عطا فرمائے اور عزیز مؤلف کو اس طرح کے علمی کام کی مزید توفیق بخشے۔ (آمین ثم آمین)

خیر خواہ

(مولانا) عبدالخالق سنبھلی

مدرس دارالعلوم دیوبند (۱۸/۶/۱۴۱۸ھ)

تقریظ

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم

استاذ شعبۂ افتاء ومرتب فتاویٰ دار العلوم دیوبند

اللہ رب العلمین کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت امام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے مشورے اور اپنے احباب کے تعاون سے جس دار العلوم دیوبند کی داغ بیل ڈالی تھی، وہ برابر اشاعت علم ودین کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور سارے عالم کے مسلمان اس سے مستفید ہورہے ہیں۔ یہاں سے ہر دور میں بڑے بڑے منتخب علماءِ عصر پیدا ہوئے اور یہاں کی تعلیم وتدریس پورے عالم اسلام میں مقبول ومشہور ہوئی۔ علم حدیث وفقہ یہاں کا خاص فن ہے اور علماءِ دیوبند ان فنون میں ممتاز شمار ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہئے۔

ابھی اسی سال یہاں ایک متعلّم حدیث نے ایک مختصر کتاب مرتب کی ہے، جو کہ بڑی عالمانہ انداز کی ہے اور ماشاء اللہ علماء وطلباء میں مقبول ہے۔ خاکسار نے بھی اس کا مطالعہ کیا، مجھے پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہمارے عزیز گرامی قدر مولانا مفتی عبد الغفور سنبھلی نے بڑی محنت وکاوش سے اس میں بڑے اہم مسائل یکجا کرنے کی سعی کی ہے اور اس کا نام ''اختلاف الائمہ فی المسائل المہمہ'' رکھا ہے۔ حدیث کے جس قدر ابواب ہیں، ان پر مختصر گفتگو کی ہے، اسی کے ساتھ ائمہ اربعہؒ وائمہ حدیثؒ کے مذاہب بیان کرنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ ایک طالب علم اور ایک عالم بڑی آسانی کے ساتھ اسے دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے کہ کن مسائل میں ائمہؒ کا کیا مذہب ہے؟ ہر ایک کی کیا دلیل ہے؟ احناف کی طرف سے اس کا کیا جواب دیا گیا ہے، یا علماءِ احناف نے تطبیق کی کیا صورت اختیار کی ہے، جس سے ایک باب کی ساری حدیثوں پر عمل آسان ہوگیا ہے۔

عزیز مخلص کی گرانقدر خدمت بہت پسند آئی، اور دل سے دعائیں نکلیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ تمام اہم مسائل کو یکجا کرادے اور ہمارے عزیز طلبہ اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی سعی کریں۔ اخیر میں دعا ہے کہ عزیز محترم کی یہ محنت مقبول بارگاہِ الٰہی اور آئندہ علمی کاموں کے لئے زینہ کا کام دے ...... ع تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

طالب دعا محمد ظفیر الدین غفرلہٗ ٨؍رجب المرجب ١٤١٩ھ بروز جمعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن اولیں

نحمدهٗ ونصلی علی رسوله الكريم، وبعد!

احادیث مبارکہ کے فقہی مسائل میں فقہاء کرام کے اقوال اوران کے دلائل اوران دلائل پر ردوقدح پر مشتمل یہ مختصری کتاب قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

گوکہ احادیث مبارکہ کے درس سے اصل مقصود نفس اقوال ودلائل کا احاطہ نہیں ہوتا مگر دوران درس اس کی ضرورت سے بھی انکار نہیں۔ بنابریں فاضل دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا عبدالغفور سنبھلی دامت برکاتہم نے بڑی عرق ریزی وجانفشانی کے ساتھ مختلف ماخذ کی مدد سے کثیر کتب کی مراجعت کے بعد اہم ابواب پر مشتمل یہ مجموعہ تیار کیا اوراس پر اپنے موٴقر اساتذہ کرام سے دادِ تحسین وصول کرنے کے بعد اس کی عمومی اشاعت فرمائی۔

ناکارہ کو جب کتاب کا ایک نسخہ پیش کیا گیا تو پیش کرنے کے ساتھ ہی محترم دوست ومالک اسلامی کتب خانہ مولانا شعیب صاحب نے یہ فرمائش بھی کی کہ کتاب کی ترتیب ہمارے یہاں کے مروجہ طریقۂ درس وتدریس کے مطابق کرنے کی ضرورت ہے نیز مزید افادیت کے لیے کچھ اضافہ بھی درکار ہے۔ چنانچہ تعمیل حکم میں از اول تا آخر کتاب کی ترتیب باعتبار عنوانات تبدیل کردی، اور حسب ضرورت دیگر کتب سے اقتباس نقل کر کے وہیں اس کا حوالہ بھی دے دیا نیز تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا اور طلبۂ حدیث کے فائدے کے لیے شروع کتاب میں علم حدیث کی اہم اور ضروری اصطلاحات درج کردی ہیں۔۔ امید ہے کہ یہ کتاب درجہ سابعہ (موقوف علیہ) ودورۂ حدیث کے طلبہ کے لیے یکساں طور پر مفید رہے گی۔

اللہ رب العزت ہماری اس حقیری سی کاوش کو اپنی بارگاہِ عالی میں شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

فیضان الرحمٰن کمالؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم حدیث کی چند اہم اصطلاحات

حدیث، خبر اور اثر میں فرق:

حدیث اور خبر کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ دونوں مترادف ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ حدیث کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال وغیرہ پر ہوتا ہے اور خبر عام ہے احادیث نبوی ﷺ اور اخبارِ سلاطین وملوک پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

حدیث اور اثر میں فرق یہ ہے کہ حدیث کا اطلاق عموماً اقوال وافعال نبوی ﷺ پر ہوتا ہے جبکہ اثر عموماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال افعال پر بولا جاتا ہے۔

حدیث کی اقسام:

حدیث دو قسم پر ہے۔ 1 خبر متواتر 2 خبر واحد۔

خبر متواتر: وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ گھڑنے پر اتفاق کو عقل سلیم محال سمجھے۔

خبر واحد: وہ حدیث ہے جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں۔

خبر واحد کی مختلف اعتباروں سے تقسیم کی جاتی ہے۔

خبر واحد: اپنے مُنتہیٰ کے اعتبار سے تین قسم پر ہے: 1 مرفوع 2 موقوف 3 مقطوع

مرفوع: وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل یا تقریر (یعنی صحابۂ کرامؓ کوئی کام کرتے ہوئے دیکھ کر اس کام پر نکیر نہ فرمانا) کا ذکر ہو۔

موقوف: وہ حدیث ہے جس میں صحابی کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

مقطوع: وہ حدیث ہے جس میں تابعی کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

خبر واحد: راویوں کی تعداد کے اعتبار سے بھی تین قسم پر ہے: مشہور، عزیز، غریب۔

مشہور: وہ حدیث ہے جس کے راوی ہر زمانے میں تین سے کم کہیں نہ ہوں۔

عزیز: وہ حدیث ہے جس کا راوی ہر زمانے میں دو سے کم کہیں نہ ہوں۔

غریب: وہ حدیث ہے جس کا راوی کہیں نہ کہیں ایک ہو۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم:

خبر واحد قوّت اور ضعف کے اعتبار سے دو قسم پر ہے۔

مقبول: وہ حدیث ہے جس کے راوی کا سچا ہونا غالب ہو۔

مردود: وہ حدیث ہے جس کے راوی کا سچا ہونا غالب نہ ہو۔

حکم: حدیث مقبول سے استدلال کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے اور حدیثِ مردود سے نہ استدلال کر سکتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنا واجب ہے جب تک کہ راویوں کے حالات سے مکمل طور پر بحث نہ کر لی جائے۔

حدیث مقبول:

مراتب کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو قسم پر ہے۔(۱) صحیح۔(۲) حسن۔

صحیح کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل (معتبر) اور حدیث کو ضبط (یاد اور محفوظ) کرنے والے ہوں اور اس کی سند اپنے قائل تک متصل ہو (بیچ میں کوئی راوی حذف نہ ہوا ہو) معلل اور شاذ ہونے سے محفوظ ہو۔

حسن کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کے راوی میں صرف ضبط ناقص ہو، باقی سب شرائط حدیث صحیح کی اس میں موجود ہوں۔

صحیح اور حسن دو قسموں پر منقسم ہے۔ (۱) لذاتہٖ۔(۲) لغیرہٖ۔

صحیح لذاتہٖ:۔

وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل (ثقہ یعنی نہایت معتبر) ہوں اور حدیث شریف کو سند کے ساتھ خوب اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں اور سند بھی متصل ہو۔

صحیح لغیرہٖ:

وہ حدیث ہے جو دراصل حسن لذاتہٖ ہے مگر اس کی سندیں اس قدر کثیر ہیں کہ ان سے راوی کے حفظ میں جو کمی تھی اس کی تلافی ہوگئی۔

حسن لذاتہٖ:

وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی خفیف الضبط ہو (یادداشت کمزور ہو)۔

حسن لغیرہٖ:

وہ حدیث ہے جس کے کسی راوی میں ثقاہت (بھروسہ کے قابل ہونا) کی تمام

صفات یا بعض نہ پائی جاتی ہوں۔مگر سندیں کثیر ہونے سے اس نقصان کی تلافی ہوگئی ہو۔

حدیث مقبول:

تعارض واقع ہونے کے اعتبار سیسات قسموں جوکہ درجِ ذیل ہیں: (۱) محکم۔ (۲) مختلف الحدیث (۳) ناسخ (۴) منسوخ (۵) راجح (۶) مرجوح (۷) متوقف فیہ۔

محکم کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی مخالف کوئی حدیث نہ ہو۔

مختلف الحدیث:

وہ متعارض حدیثیں ہیں جوصحت میں برابر ہوں اوران کا جمع کرنا ممکن ہو۔

ناسخ اور منسوخ کی تعریف:

وہ متعارض حدیثیں ہیں جوصحت میں برابر ہوں اوران میں جمع بھی ممکن نہ ہو۔مگر تاریخ سے ایک کا مقدم اوردوسری کا مؤخر ہونا ثابت ہوجائے۔تو مقدم کومنسوخ اور مؤخر کوناسخ کہیں گے۔

راجح اور مرجوح کی تعریف:

وہ متعارض حدیثیں ہیں جوصحت میں برابر ہوں اوران میں جمع بھی ممکن نہ ہو اوران میں تقدم وتأخر بھی ثابت نہ ہومگر کسی ایک کودوسرے پرترجیح دینا ممکن ہوتو جس حدیث کوعمل کے لئے ترجیح دیں گے وہ راجح کہلائے گی اوردوسری مرجوح ہوگی۔

متوقف فیہ کی تعریف:

وہ متعارض حدیثیں ہیں جوصحت میں برابر ہوں مگرنہ ان میں جمع ممکن ہواورنہ تقدم وتأخر ثابت ہو۔اورنہ ایک کودوسرے پرترجیح دینا ممکن ہوتو جب تک ان حدیثوں میں سے کسی ایک پرعمل کی کوئی صورت ظاہرنہ ہو،توقف کیا جائے گا۔

حدیث ضعیف:

وہ حدیث ہے جس کے راوی میں حدیث صحیح وحسن کی شرائط نہ پائی جائیں۔

حکم:

حدیث ضعیف کا ضعف بیان کیے بغیر روایت کرنا درست ہے البتہ عقائد، فرض وواجب اس سے ثابت نہیں ہوسکتے اور استحباب ثابت کرنے کے لئے بھی تین شرطیں ہیں: (۱) ضعف شدید نہ ہو۔ (۲) کسی شرعی قاعدہ کے خلاف نہ ہو۔ (۳) عمل کرتے وقت اس کے مکمل طور پر ثابت ہونے کا گمان نہ رکھے بلکہ احتیاط سمجھ کر عمل کرے۔

حدیث مردود کی اقسام:

حدیث کے غیر مقبول ہونے کا سبب یا تو سند کے اندر کسی راوی کا چھوٹ جانا ہوگا اور یا کسی راوی پر جرح وطعن۔ اگر اس کا سبب راوی کا سقوط ہو تو اس کی پانچ قسمیں مشہور ہیں۔ (۱) معلق (۲) مرسَل (۳) معضَل (۴) منقطع (۵) مدلَّس۔

معلَّق کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی سند کا ابتدائی حصہ حذف کردیا گیا ہو۔

مرسَل کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی سند کا آخری حصہ نہ بیان کیا گیا ہو۔ اگر ثقہ راوی حدیث کو مرسل نقل کرے تو جمہور کے نزدیک وہ حدیث مقبول ہے اور جو غیر ثقہ مرسل نقل کرے وہ عندالجمہور غیر مقبول ہے۔

معضَل:

وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے دو یا زیادہ راوی مسلسل حذف ہوگئے ہوں۔

منقطع کی تعریف:

وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے صرف ایک راوی حذف ہوا ہو یا چند راوی حذف ہوئے ہوں مگر مسلسل نہیں بلکہ الگ الگ مقام پر حذف ہوئے ہوں۔

مدلَّس:

وہ حدیث ہے جس کے راوی کی یہ عادت ہو کہ وہ اپنے شیخ یا شیخ کے شیخ کا نام

چھپالیتا ہو۔

حدیث متصل ومُسنَد:

اگر سند میں کوئی راوی ساقط نہ ہوتو وہ حدیث متصل ہے اور جب ایسی حدیث کی نسبت جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کی جانب ہوتو وہ حدیث مسند کہلائے گی۔

راوی پر طعن کے دس اسباب

راوی پر طعن سے مراد "راوی میں کوئی ایسی خرابی اور عیب ہونا ہے جو قبولِ حدیث کے لئے مانع ہو"۔ اس کے دس اسباب ہیں جن کی وجہ سے حدیثِ غیر مقبول کے درجے بھی مختلف ہیں۔ وہ دس اسباب یہ ہیں: (۱) کذب (۲) تہمت کذب (۳) فسق (۴) جہالت (۵) بدعت (۶) فحش غلطی (۷) کثرت غفلت (۸) وہم (۹) مخالفت ثقات (۱۰) سوءحفظ

کذب فی الحدیث:

یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف بالقصد کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا۔ بہت سخت عیب اور بہت بڑا گناہ ہے۔

تہمت کذب:

یعنی جھوٹ کا الزام۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی کے متعلق یہ بات تو ثابت نہیں ہوئی کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف قصداً کوئی جھوٹ بات منسوب کی ہے مگر کچھ ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جن سے کذب فی حدیث الرسول کی بدگمانی ہوتی ہے۔

فسق:

بددین ہونا۔ یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جو کسی قولی یا فعلی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے مثلاً زنا، چوری وغیرہ کرتا ہے۔

جہالت:

یعنی راوی کا حال معلوم نہ ہونا کہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔

بدعت:

یعنی دین میں کوئی ایسی جدّت (ایجاد) کرنا جس کی اصلیت قرآن کریم میں یا

حدیث شریف یا قرون مشہود لہا بالخیر (زمانۂ صحابہ وتابعین وتبع تابعین) میں نہ پائی جاتی ہو۔

فحش غلطی:

یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جس کی غلط بیانی، صحت بیانی سے زائد ہو۔

کثرت غفلت:

یعنی بہت زیادہ غفلت۔ یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جو حدیث کے اتقان یعنی خوب اچھی طرح محفوظ کرنے سے اکثر غفلت برتتا ہو۔

وہم:

بھول کر غلطی کرنا یعنی سند میں یا متن میں تغیر وتبدل کر دینا۔ مثلاً حدیث مرسل یا منقطع کو متصل کر دینا۔

سوءِ حفظ:

یعنی یادداشت کی خرابی۔ یہ طعن اس راوی پر لگتا ہے جس کی غلط بیانی حافظہ کی وجہ سے، صحت بیانی سے زائد یا برابر ہو۔

باعتبار طعن فی الراوی حدیث غیر مقبول کی اقسام

حدیث موضوع:

یعنی گھڑی ہوئی حدیث وہ ہے جس کے راوی پر حدیث نبوی ﷺ میں جھوٹ بولنے کا طعن موجود ہو۔

حدیث متروک:

یعنی چھوڑی ہوئی ساقط الاعتبار حدیث وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو یا وہ روایت قواعدِ معلومہ فی الدین کے مخالف ہو۔

حدیث منکر:

وہ حدیث ہے جو کسی ایسے راوی سے مروی ہو جو فحش غلطی یا کثرتِ غفلت یا فسق کے ساتھ مطعون ہے۔ اسی طرح وہ حدیث جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعتِ ثقات کے مخالف روایت کرے۔

حدیث معروف:

وہ حدیث ہے جو منکر کے مقابل ہو۔

حدیث معلَّل:

وہ حدیث جس میں راوی نے وہم کی وجہ سے تغیر وتبدل کردیا ہو، نیز وہ حدیث بھی کہ جس میں کوئی ایسی پوشیدہ علت ہو جو صحت حدیث میں نقصان دیتی ہے ،اس کو معلوم کرنا ماہر فن ہی کا کام ہے۔

حدیث شاذ:

وہ حدیث جس کا راوی خود ثقہ ہو مگر ایک ایسی کثیر جماعت کے برخلاف روایت کرتا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہیں۔

حدیث محفوظ:

وہ حدیث جو شاذ کے مقابل ہو۔

حدیث مضطرب:

وہ حدیث جس کی سند میں یا متن میں تغیر وتبدل کی وجہ سے ثقہ راوی سے اختلاف پیدا ہوگیا ہو اور دونوں روایتوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا یا دونوں کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہو۔

مصحَّف ومحرَّف:

وہ حدیث جس میں سند اور متن کی صورت تو بدستور باقی رہے مگر ایک حرف یا چند حروف بدل جانے کی وجہ سے ثقہ راوی کی مخالفت ہوگئی ہو، پھر اگر حرف کا تبدل صرف نقطوں کے ذریعہ ہے (مثلاً طاء کو ظاء یا صاد کو ضاد نقل کرنا) تو وہ مصحَّف ہے اور اگر ایک حرف کی شکل دوسرے حرف سے بدل گئی ہو (مثلاً سین کو صاد یا ضاد کو ظاء روایت کرنا) تو وہ محرَّف ہے۔

مقلوب:

وہ حدیث جس کے راویوں کے ناموں میں یا متنِ حدیث میں اُلٹ پھیر ہوگئی ہو۔

مُدرَج:

وہ حدیث جس میں کوئی راوی اپنا کلام درج کرے اور فرق کرنا مشکل ہو۔

تنبیہ:

اگر حدیث صحیح یا حسن کا راوی کوئی زائد مضمون بیان کرے اور وہ زیادتی اس سے زیادہ ثقہ راوی کے بیان کے خلاف ہو تو اس مضمون کو یا تو مستقل حدیث قرار دیں گے یا حدیث کا باقی ماندہ حصہ کہیں گے۔

بدعتی کی روایت:

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ اول: مستلزم کفر یعنی جس سے کفر لازم آتا ہو جیسے ختم نبوت کا انکار۔ دوم: مستلزم فسق جیسے عام عقائد و خیالات فاسدہ۔

بدعتی کی روایت کا حکم:

مستلزم کفر کی حدیث جمہور کے نزدیک مقبول نہیں ہے اور مستلزم فسق کی حدیث اس وقت قبول ہے جب وہ حدیث اس کے منشا اور بدعت کی ترویج کے خلاف ہو اور اس پر اِس حدیث کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے روایت کا الزام بھی نہ ہو۔

شاہد اور متابع

اگر کسی درجہ میں خبر واحد سمجھے جانے والی حدیث کے ہم معنی یا ہم لفظ حدیث موجود ہو تو اس دوسری حدیث کو ''شاہد'' کہتے ہیں اور اگر ایسی خبر واحد کی سند ایک راوی کے بجائے دو یا دو سے زائد راوی نقل کریں تو پہلی حدیث ''مُتابَع'' اور دوسری حدیث اس کی ''متابِع'' کہلائے گی۔

صحابی کی تعریف:

وہ شخص جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر ان کا خاتمہ ہوا ہو۔

تابعی کی تعریف:

وہ شخص جنہوں نے بحالت ایمان کسی صحابی سے ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر ان کا خاتمہ ہوا ہو۔ جیسے امام اعظم ابوحنیفہؒ کہ حضرت انسؓ سے آپ کی ملاقات ثابت ہے۔

جرح وتعدیل کے مراتب..... محدثین جب کسی راوی کی توثیق وتعدیل (قابل اعتبار قرار دینا) بیان کرتے ہیں یا کسی راوی پر جرح (تنقید وتضعیف) کرتے ہیں تو اس کے لئے مخصوص الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں کچھ نہایت اعلیٰ ہیں اور کچھ متوسط اور کچھ ادنیٰ۔ ذیل میں ان سب الفاظ کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک معتبر ترتیب کے مطابق لکھتے ہیں:۔

الفاظِ تعدیل..... (١) ثبت حجة (٢) ثبت حافظ (٣) أوثق الناس یعنی سب سے زیادہ معتبر (٤) ثقة متقن (٥) ثقة ثبت (٦) ثقة ثقة (٧) ثقة (٨) صدوق (٩) لابأس به (١٠) ليس به بأس (١١) محله الصدق (١٢) جيد الحديث (١٣) صالح الحديث (١٤) شيخ (١٥) شيخ وسط (١٦) شيخ حسن الحديث (١٧) صدوق ان شاء الله (١٨) صويلح.

الفاظ جرح..... (١) أكذب الناس (٢) دجال كذاب (٣) وضاع يضع الحديث (٤) متهم بالكذب (٥) متفق على تركه (٦) متروك (٧) ليس بثقة (٨) سكتوا عنه (٩) ذاهب الحديث (١٠) فيه نظر (١١) هالك (١٢) ساقط (١٣) واه بمرة (١٤) ليس بشيء (١٥) ضعيف جدا (١٦) ضعفوه (١٧) ضعيف واه (١٨) سيء الحفظ (١٩) فيه ضعف (٢٠) قد ضعف (٢١) ليس بالقوي (٢٢) ليس بحجة (٢٣) ليس بذاك (٢٤) يعرف وينكر (٢٥) فيه مقال (٢٦) تكلم فيه (٢٧) لين وغیرہ۔

کتب حدیث کی اقسام

حدیث کی کتابیں اپنی خاص ترتیب اور وضع کے اعتبار سے کئی قسموں پر ہیں:۔

جامع:

وہ کتاب جس میں تفسیر، عقائد، آداب، احکام، مناقب، سیر، فتن، علامات قیامت، فقہی احکام اور مناقب وغیرہ ہر قسم کے مسائل کی حدیثیں جمع کی گئی ہوں جیسے: جامع بخاری۔

سنن:

وہ کتاب ہے جس میں احادیث کو فقہی ترتیب سے جمع کیا جاتا ہے۔ ایسی کتاب کا خاص مقصد فقہاء کے دلائل کو جمع کرنا ہے جیسے: سنن ترمذی، سنن

ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، سنن دارقطنی، سنن بیہقی۔

مسند:

وہ کتاب جس میں احادیث کو صحابۂ کرامؓ کے ناموں کی ترتیب سے جمع کیا گیا ہو یعنی ہر صحابی کی تمام مرویات ایک جگہ ذکر کردی گئی ہوں، خواہ کسی بھی باب سے متعلق ہوں۔ یہ ترتیب کبھی صحابہ کرام کے مرتبوں کے اعتبار سے رکھی جاتی ہے اور کبھی حروف ہجا کے اعتبار سے اور کبھی پہلے یا بعد میں اسلام لانے کے اعتبار سے جیسے: مسند احمد، مسند دارمی، مسند بزار (جس کا اصل نام البحر الزخار ہے) اور مسند ابوداؤد طیالسی۔

مُعْجَم:

وہ کتاب جس میں محدث اپنے شیوخ اور اساتذۂ حدیث کے ناموں کی ترتیب سے احادیث کو جمع کرے اس طور پر کہ ہر شیخ کی مرویات یکجا مل جائیں خواہ مختلف ابواب سے متعلق ہوں۔ جیسے: معاجم ثلاثہ للطبرانی (المعجم الصغیر، المعجم الاوسط، المعجم الکبیر)۔

جزء:

وہ کتاب جس میں صرف ایک مسئلہ سے متعلق تمام روایات یکجا کردی گئی ہوں جیسے امام بخاریؒ کی جزء رفع الیدین، اور جزء القراءۃ، اور امام بیہقیؒ کی جزء القراءۃ۔

مفرد یا اَفراد:

وہ کتاب جس میں صرف ایک محدث کی کل مرویات کا احاطہ کیا جائے جیسے کتاب الأفراد للقرطبیؒ۔

غریب:

وہ کتاب جس میں کسی محدث کی انفرادی احادیث کو جمع کیا جائے جن کو وہ مخصوص شیخ سے روایت کرے، جیسے غرائب امام مالکؒ۔

مُستدرَک:

وہ کتاب جس میں کسی دوسری کتابِ حدیث میں ملحوظ شرائط پر پورا اترنے والی ان احادیث کو جمع کیا گیا ہوں جو اس کے مصنف سے رہ گئی ہوں جیسے امام

حاکم نیشاپوریؒ کی مستدرک علی الصحیحین (یعنی صحیح بخاری ومسلم کے معیار کے مطابق احادیث کا مجموعہ)۔

مستخرج:

وہ کتاب جس میں کسی دوسری کتاب حدیث کی حدیثوں کو مصنف کے واسطہ کے بغیر اس کے شیوخ واساتذہ سے نقل کیا جائے جیسے مستخرج اسماعیلی علی صحیح البخاری ومستخرج ابوعوانہ علی صحیح مسلم۔

تجرید:

وہ کتاب جس میں کسی دوسری کتابِ حدیث کی احادیث کو سند اور مکررات کے بغیر صرف صحابی کے واسطہ سے نقل کیا جائے جیسے تجرید صحیح البخاری للزبیدیؒ وتجرید صحیح مسلم للقرطبیؒ۔

تخریج:

وہ کتاب جس میں کسی دوسری کتاب کی بے حوالہ حدیثوں کے لئے سند اور حوالہ پیش کیا جائے جیسے ہدایہ کی احادیث کی تخریج جو امام زیلعیؒ نے کی بنام ''نصب الرایہ''، اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی ''الدرایہ'' اور التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الیافعی الکبیر۔

کتبِ جمع:

وہ کتابیں جن میں ایک سے زائد کتابوں کی احادیث کو سند اور مکررات کے حذف کے ساتھ جمع کیا جائے جیسے ''الترغیب والترہیب للمنذری'' اور مشکوٰۃ المصابیح۔

أطراف:

وہ کتاب حدیث جس میں احادیث کا اول حصہ ذکر کر کے اس کی تمام سندوں یا مراجع کی نشاندہی کی جائے جیسے تحفۃ الأشراف بمعرفۃ الأطراف للامام المزیؒ، اور معاصر محقق محمد سعید بیسونی آل زغول کی ''موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی الشریف''۔

فہارس یا مفہرس :

وہ کتاب جس میں ایک یا ایک سے زیادہ کتابوں کی احادیث کی فہرست حروف

ہجا کے اعتبار سے یکجا کردی جائے جیسے فہرس الفہارس لعبد الحی الکتانی ،اور معاصر محقق دکتور فواد عبد الباقی کی ''المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی ﷺ''۔

اربعین:

یعنی چہل حدیث؛ وہ کتاب جس میں کسی ایک یا ایک سے زیادہ موضوعات سے متعلق کم وبیش چالیس حدیثیں جمع کی جائے جیسے امام نوویؒ کی الأربعین وغیرہ۔

موضوعات:

وہ کتاب جس میں موضوع احادیث کو جمع کیا جائے جیسے امام ابن الجوزیؒ کی ''الموضوعات'' امام سیوطیؒ کی ''اللآلی المصنوعہ فی الأحادیث الموضوعہ'' ملاعلی قاریؒ کی ''الموضوعات الکبریٰ'' اور علامہ عبد الحی لکھنویؒ کی ''الآثار المرفوعہ فی الأخبار الموضوعہ'' وغیرہ۔

الأحادیث المشہورۃ:

وہ کتاب جس میں مشہور احادیث کی تحقیق کی جائے کہ وہ ثابت بھی ہیں یا فقط زبان زد خلائق ، جیسے ''کشف الخفا ومزیل الالباس للعجلونی''۔

غریب الحدیث:

وہ کتاب جس میں احادیث مبارکہ کے مشکل یا قلیل الاستعمال الفاظ کی مراد واضح کی جائے ، جیسے ''النہایہ فی غریب الحدیث والأثر للامام ابن الأثیر الجزریؒ''۔

عِلل:

وہ کتاب جس میں ایسی احادیث سے بحث کی جاتی ہے جن کی سندوں میں کلام ہوتا ہے یا فقط حدیث کی پوشیدہ علتوں کا ذکر ہوتا ہے جیسے العلل الکبیر والعلل الصغیر للترمذیؒ۔

الزوائد:

وہ کتاب جس میں کسی دوسری کتاب کی صرف ان احادیث کو علیحدہ سے ذکر کیا جائے جو ایک متعینہ کتاب میں نہ ہوں ، جیسے ''مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للامام الہیثمیؒ''۔

صحیح:

وہ کتاب جس کا مصنف اپنی کتاب میں صحیح احادیث ہی ذکر کرنے کا التزام

کرے جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم وصحیح ابوعوانہ وغیرہ۔

طلبِ حدیث کے آداب

ذیل میں طلب حدیث کے چند اہم آداب بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) طالبِ حدیث کو چاہیے کہ نیت خالص کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے حدیث کا علم حاصل کرے۔

(۲) اپنے استاذِ حدیث کا بلحاظ عالم دین ہونے کے انتہائی عزت واحترام کرے۔

(۳) استفادہ کرنے میں بالکل نہ شرمائے۔

(۴) فرائض وواجبات اور سنن کا اہتمام کرے۔

(۵) گناہوں سے حد سے زیادہ اجتناب کرے۔

(۶) بالخصوص غیبت، مذاق اور ساتھیوں کو ستانے سے احتراز کرے۔

(۷) کتاب اور درسگاہ ودیگر آلات علم کا پورا پورا احترام کرے۔

(۸) شروع سے آخر تک سبق میں حاضر رہے۔

[اقتباس از: مقدمہ درس آثار السنن شرح اردو آثار السنن، تالیف: مفتی فیضان الرحمٰن کمالؔ]

﴿مندرجہ بالا اصولوں کا ذہین نشین رکھنا حدیث کے طالبعلم کے لیے ازبس ضروری ہے﴾

کتاب الایمان

الایمان مرکب ام بسیط؟...... ''ایمان مرکب ہے یا بسیط؟''

ایمان مرکب ہے یا بسیط، اس سلسلہ میں چھ اقوال ہیں، جن میں سے دو صحیح اور چار باطل ہیں۔ جہمیہ، کرامیہ اور مرجیہ کے نزدیک ایمان بسیط ہے یعنی صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہی نجات کے لیے کافی ہے اعمال کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ......

جہمیہ...... کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے فقط معرفت قلبی کا، تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کی ضرورت نہیں ہے۔

دلیل...... یہ حضرات حدیث نبوی: ''**من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة**'' (مسلم شریف ص ۴۱، جلد ۱) سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ توحید کے جاننے پر ہی دخول جنت

کی ضمانت دی ہے۔ معلوم ہوا کہ دل سے تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔ اور نہ ہی اقرار وعمل کی ضرورت ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث مذکور میں **یعلم** سے لغوی معنی (جاننا) مراد نہیں ہے۔ بلکہ دل سے تصدیق کرنا مراد ہے، جیسا کہ دوسری حدیث میں ''**غیر شاک فیھما**'' (مسلم: ۱/۴۱، حاشیہ النووی و فتح الملہم: ۱/۱۹۹) وغیرہ کی قید سے معلوم ہوتا ہے نیز اگر ایمان کیلئے فقط معرفت قلبی کافی ہوتی تو تمام یہود و نصاریٰ مومن ہوتے، اس لئے کہ ان کے بارے میں آیا ہے۔ **یعرفونہٗ کما یعرفون ابنائھم** تو معرفت تو ان کو حاصل تھی پھر بھی وہ مومن نہیں۔ معلوم ہوا کہ محض علم و معرفت ایمان کے پائے جانے کیلئے کافی نہیں ہے۔

کرامیہ...... کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے فقط اقرار لسانی کا۔ تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان کی ضرورت نہیں ہے۔

دلیل...... یہ حضرات حدیث نبوی ''من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ'' (مجمع الزوائد ص۱۸، ج۱) کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف زبان سے کہنے پر دخول جنت کی خبر دی ہے، تصدیق وعمل کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث مذکور میں صرف زبان سے کہنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ دل کی تصدیق کے ساتھ زبان سے کہنا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث (الجامع الصغیر للسیوطی ص۱۷۶ ج۲ مجمع الزوائد ص۱۷ ج۱) میں **موقنًا** و **مخلصاً** وغیرہ کی قید سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز اگر ایمان کیلئے فقط اقرارِ لسانی کافی ہوتا تو عبداللہ ابن اُبی اور اس کے سارے ساتھی مومن ہوتے۔ اس لئے کہ زبان سے تو وہ بھی اقرار کرتے تھے، لیکن پھر بھی وہ کافر کے بچے منافق کے منافق ہی رہے معلوم ہوا کہ فقط اقرار باللسان ایمان کیلئے کافی نہیں ہے۔

مرجیہ...... کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے فقط تصدیق قلبی کا۔ اور بس اتنا ہی نجات اور جنت میں دخول اولیں کیلئے کافی ہے، عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے نیز آدمی خواہ کتنے ہی گناہ کرے جہنم میں نہیں جائے گا۔ اس کا ایمان اسے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔

دلیل...... یہ حضرات حدیث نبوی: ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذٰلک الا دخل الجنۃ'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وان زنی وان سرق؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وان زنی وان سرق؟ (مسلم ص۶۶

ج۱، کتاب الایمان، بخاری ج۲، کتاب اللباس باب ثیاب البیض) کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا اور سرقہ کے باوجود بھی جنتی فرمایا عذاب کا کوئی ذکر نہیں کیا، معلوم ہوا کہ اگر ایمان موجود ہے تو گناہوں پر کوئی عذاب نہ ہوگا۔ (فتح الملہم ص ۱۹۸ ج ۱ وفیض الباری) بلکہ اس کا ایمان اسے سیدھا جنت میں لے جائے گا، اس لئے تصدیق قلبی کے بعد عمل وغیرہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ ایمان نام ہے صرف تصدیق قلبی کا۔ یہ تو ہمیں تسلیم ہے، لیکن نجات عن النار اور جنت میں دخول اولیں کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہے، عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ ہم کو تسلیم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر اعمالِ صالحہ کی بالکل ضرورت ہی نہ ہوتی اور نہ ہی گناہوں سے کوئی نقصان ہوتا، تو قرآن کریم واحادیث صحیحہ میں اتنے بڑے پیانے پر عمل کرنے کا حکم نہ دیا جاتا اور نہ ہی گناہوں سے روکا جاتا۔

معلوم ہوا کہ تصدیق قلبی کے بعد عمل کرنے اور گناہوں سے بچنے کی ضرورت ہے، رہی حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی مومن ہو اور اس سے گناہ سرزد ہو جائے تب بھی وہ ایک نہ ایک دن ضرور جنت میں جائے گا لیکن جنت میں جانے سے پہلے اس کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس سزا کا تذکرہ اگرچہ اس حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ لیکن صرف اس حدیث میں مذکور نہ ہونے سے یہ ثابت کرنا کہ مؤمن کو اس کے گناہوں پر سزا ہی نہ ہوگی کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ جبکہ دوسری احادیث صحیحہ سے سزا کا ثبوت ملتا ہے لہٰذا اس مجمل حدیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

معتزلہ وخوارج...... کہتے ہیں کہ ایمان مرکب ہے۔ تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے، اور یہ تینوں اس کے لازمی اجزا ہیں۔ یعنی اگر ان میں سے ایک بھی فوت ہو گیا تو ایمان ہی فوت ہو جائے گا۔ اور آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا لیکن کفر میں داخل ہوگا یا نہیں، تو معتزلہ کہتے ہیں کہ کفر میں داخل نہیں ہوگا بلکہ ایمان اور کفر کے درمیان رہے گا اور خوارج کہتے ہیں کہ کفر میں بھی داخل ہو جائے گا۔ (فتح الملہم ص ۱۹۸ ج ۱)

دلیل نمبر ۱...... یہ دونوں دائرہ ایمان سے خارج ہونے پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا یزنی الزانی حین یزنی وھو

مـؤمـن ‘‘(بخاری، مسلم، ترمذی)، یعنی زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں رہتا دیکھو زانی سے عمل فوت ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایمان سے خارج فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عمل ایمان کا ایسا جزء ہے کہ اگر وہ فوت ہوجاتا ہے تو آدمی مومن نہیں رہتا۔

دلیل نمبر۲......خوارج کے نزدیک تارک عمل دائرہ ایمان سے خارج ہوکر چونکہ کفر میں بھی داخل ہوجاتا ہے اس لئے وہ الگ سے اس کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے:ومن یقتل مومناً متعمدًا فجزاؤہٗ جھنّم خالدًا فیھا۔(سورۃ النسآء پ:۵)یعنی جو مسلمان کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کردے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب کافر ہی کو ہوگا۔معلوم ہوا کہ تارک عمل اور مرتکب کبیرہ دائرہ ایمان سے نکل کر کفر میں بھی داخل ہوجاتا ہے۔

جواب:(۱)......یہ ہے کہ لا یزنی الزانی الخ کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم نے سمجھا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اتنی دیر مومن نہیں رہتا جتنی دیر زنا میں مشغول رہتا ہے۔ کیونکہ اتنی دیر اس کا ایمان قلب میں سے نکل کر سایہ کی طرح اوپر لٹکا رہتا ہے اور جب وہ زنا سے فارغ ہوجاتا ہے تو پھر اس کے قلب میں واپس آجاتا ہے(ترمذی شریف، ج۲، کتاب الایمان)اور وہ شخص مومن ہوجاتا ہے، اس لئے اس حدیث سے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دائرہ ایمان سے خارج سمجھنا غلط فہمی ہے۔نیز اگر مان بھی لیا جائے کہ ایمان کیلئے عمل ضروری ہے اور عمل نہ کرنے سے آدمی مومن نہیں رہتا تو پھر قرآن میں بہت سی جگہ مرتکب کبیرہ کو مومن کہہ کر کیوں خطاب کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:وان طـائـفتـان مـن الـمـؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما (سورۃ الحجرات) معلوم ہوا کہ عمل ایمان کا لازمی جز نہیں ہے بلکہ بغیر عمل کے بھی نفس ایمان پایا جاسکتا ہے۔

جواب:(۲)......خوارج کی دلیل آیت کریمہ کا جواب یہ ہے کہ یہاں خالدًا فیھا سے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنا مراد نہیں ہے بلکہ مکث طویل مراد ہے۔

امام شافعی وجمہور محدثین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ......ایمان مرکب ہے تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے لیکن معتزلہ وخوارج کی طرح نہیں۔بلکہ ان کے نزدیک تصدیق بالجنان اصل ہے باقی دونوں جزء رکن زائد ہیں یعنی اگر وہ دونوں نہ بھی ہوں

تب بھی آدمی محض تصدیق بالجنان کی وجہ سے مومن رہے گا یہ مذہب اعتدال پر مبنی ہے۔

دلیل محدثین......قرآن کریم واحادیث صحیحہ میں بکثرت تارک عمل کو مومن کہہ کر خطاب کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ بغیر عمل کے بھی صرف تصدیق بالجنان سے ہی ایمان کا تحقق ہو جاتا ہے۔

امام اعظم وجمہور متکلمین رحمھم اللہ کہتے ہیں کہ......ایمان بسیط ہے، نام ہے صرف تصدیق بالجنان کا۔لیکن مرجیہ کی طرح نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ اقرار باللسان دنیوی احکام جاری ہونے کے لئے ضروری ہے (مثلاً سیاست میں خلیفہ عبادت میں امام اور عدالت میں شاہد وگواہ وغیرہ) اور عمل بالارکان ایمان کو کامل ومکمل بنانے کیلئے ضروری ہے۔ یہ مذہب بھی اعتدال پر مبنی ہے۔اور یہی عندالمحققین راجح ہے۔

دلیل......**وقلبه مطمئن بالایمان**(سورۃ النحل)**اولٓئک کتب فی قلوبھم الایمان** (سورۃ الحجرات)**ولم تؤمن قلوبھم** (سورۃ المائدۃ، پ۶) وغیرہ ان تمام آیات میں ایمان کا محل قلب بتلایا گیا ہے اور قلب میں صرف تصدیق پائی جاتی ہے معلوم ہوا کہ ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ......بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اہل سنت والجماعت کے درمیان یہ اختلاف حقیقی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں، بلکہ صرف لفظی جھگڑا ہے، کیونکہ دونوں نے ایک ہی حیثیت سے ایمان کو مرکب اور بسیط نہیں کہا ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ اور محدثینؒ نے ایمان کو مرکب کہا ہے کمال ایمان کے اعتبار سے (جس کے امام اعظمؒ بھی قائل ہیں) اور جمہور متکلمین وامام اعظمؒ نے ایمان کو بسیط کہا ہے۔نفس ایمان کے اعتبار سے (جس کے امام شافعیؒ بھی قائل ہیں) معلوم ہوا کہ دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ بلکہ صرف تعبیر کا فرق ہے۔(فتح الملہم ص ۱۵۷ ج ۱ ملخصا)

تعبیر کا فرق......اہل سنت والجماعت کے درمیان جب کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔اور دونوں کا مذہب حقیقتاً یکساں ہی ہے۔تو پھر الفاظ وتعبیر کا یہ فرق کیوں پیش آیا کہ ایک نے ایمان کو مرکب کہہ کر اعمال کو اس میں داخل کر دیا، اور دوسرے نے ایمان کو بسیط مان کر اعمال کو اس سے خارج کر دیا؟

اس کا جواب حضرت شیخ الہندؒ کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں: وہ فرماتے ہیں کہ۔ان

اہل حق کا مقابلہ ہر دور میں فرق باطلہ سے رہا ہے۔اور ان حضرات نے ہمیشہ زمانے کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کا رد کیا ہے، چنانچہ امام اعظمؒ کے دور میں معتزلہ کا اثر تھا، انتہا یہ کہ حکومت کا مسلک بھی اعتزال تھا۔امام اعظمؒ نے تقاضائے عصر کے اعتبار سے معتزلہ کی پوری مخالفت کی،معتزلہ نے اعمال کو جزءایمان بتایا تو امام نے انہیں (یعنی اعمال کو) ایمان سے خارج کر دیا۔اور جب حضرت امام شافعیؒ کا دور آیا تو مرجیہ اور کرامیہ سے مقابلہ تھا، اس لئے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ تم اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلاتے ہو، میں کہتا ہوں کہ اعمال داخل ایمان اور نہایت ضروری ہیں۔(ایضاح البخاری ص ۱۵۸ ج۱)

الایمان یزید وینقص ام لا؟

ایمان بڑھتا گھٹتا ہے یا نہیں؟

امام اعظم وجمہور متکلمین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......ایمان بسیط ہے اور شئی بسیط میں اجزاء نہ ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی نہیں ہوتی، اس لئے ایمان میں بھی کمی زیادتی نہیں ہوتی۔

ائمہ ثلاثہ وجمہور محدثین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......ایمان مرکب ہے اور اعمال اس میں داخل ہیں، اس لئے اعمال کی کمی زیادتی سے ایمان میں بھی کمی زیادتی ہوتی۔

دفع تعارض......بظاہر ان دوقولوں میں بھی تعارض نظر آتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ امام اعظمؒ نے نفس ایمان میں کمی زیادتی کا انکار کیا ہے جس کے ائمہ ثلاثہ بھی قائل ہیں۔اور ائمہ ثلاثہ نے جو ایمان میں کی زیادتی ثابت کی ہے وہ اعمال کے اعتبار سے کی ہے جس کے امام اعظم رحمہ اللہ بھی قائل ہیں۔نیز اعمال کے ذریعہ برکت وکمالِ ایمان میں کمی زیادتی کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے: واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا (سورۃ الانفال پ۹) اور ''فزادھم ایماناً'' اور نفس ایمان کے نہ بڑھنے گھٹنے کا قوی ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں جابجا ایمان پر عمل صالح کا عطف واؤ کے ذریعہ کیا گیا جو دونوں کے درمیان مغایرت اور علیحدگی والے ربط کی دلیل ہے،لہذا عمل کی وجہ سے نفسِ ایمان نہیں بڑھا۔

الغرض......باتفاق اھل سنت والجماعت نفس ایمان لا یزید ولا ینقص اور کمال ایمان یزید وینقص.

ایمان اور اسلام کے درمیان نسبت

اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں:

ائمہ ثلاثہ وجمہور محدثینؒ اور خوارج ومعتزلہ کے نزدیک ......اور اسلام کے درمیان تساوی وترادف کی نسبت ہے، مفہوم کے اعتبار سے بھی اور وجود کے اعتبار سے بھی۔

دلیل......آیت کریمہ ہے: ''فاخرجنا من کان فیھا من المؤمنین، فما وجدنا فیھا غیربیت من المسلمین''۔(سورۃ الذاریات، پ:۲۷)

حضرت لوط علیہ السلام کی بستی میں صرف آپ علیہ السلام کا گھرانہ دیندار تھا اور اس پر ایمان اور اسلام دونوں کا اطلاق کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور اسلام دونوں ایک ہی چیز ہے کوئی الگ الگ چیز نہیں۔

امام اعظم ومتکلمینؒ کے نزدیک......مفہوم کے اعتبار سے تو دونوں الگ الگ ہیں۔

تغائر کی دلیل......آیت کریمہ ہے: ''قالت الاعراب اٰمنّا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا''(حجرات پ:۲۶) آیتِ کریمہ میں اعرابیوں سے ایمان کی نفی جبکہ اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان الگ چیز ہے اور اسلام الگ چیز ہے۔

لیکن وجود کے اعتبار سے عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے اور عموم خصوص من وجہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تین صورتیں ہوں گی: ایک جگہ تو دونوں جمع ہو جائیں گے، یعنی ایمان واسلام دونوں پائے جائیں گے۔ ایک جگہ صرف ایمان پایا جائے گا اسلام نہیں اور ایک جگہ صرف اسلام پایا جائے گا ایمان نہیں پایا جائے گا۔ اس طرح تین صورتیں وجود میں آئیں گی (مگر یہ نسبت متحقق نہیں ہے)۔ (فیض الباری کتاب الایمان)

ملا علی قاریؒ کے نزدیک ......عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے: ایمان عام ہے (جو فقط تصدیق قلبی کا نام ہے، تسلیم ظاہری ہو یا نہ ہو)۔ اور اسلام خاص ہے (جو تصدیق وتسلیم دونوں کے مجموعے پر بولا جاتا ہے)۔ پس ہر اسلام ایمان ہے اور ہر ایمان اسلام نہیں ہے۔

دلیل......آیت کریمہ ہے: ان الدین عند اللہ الاسلام۔ (ال عمران پ۳) آیت کریمہ میں اسلام کو دین کہا گیا ہے اور دین تصدیق وعمل کے

مجموعے کا نام ہے، لہٰذا اسلام بھی دونوں کا مجموعہ ہے۔
سید مرتضٰی حسن زبیدی رحمہ اللہ کے نزدیک...... دونوں (ایمان اور اسلام) میں تغایر فی المفہوم تلازم فی الاعتبار ہے۔ یعنی مفہوم تو دونوں کا جدا جدا ہے لیکن اعتبار ہر ایک کا دوسرے کو مستلزم ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کے لئے شرط ہے۔ تو ایمانِ معتبر نام ہے انقیادِ باطنی کا بشرطِ تسلیم ظاہری۔ اور اسلامِ معتبر ہے تسلیم ظاہری کا بشرط انقیاد باطنی۔ پس ایمان وہ معتبر ہے جو پھوٹ پھوٹ کر اسلام بنتا چلا جائے۔ اور اسلام وہ معتبر ہے جو رچ رچ کر ایمان بنتا چلا جائے۔ اور یہی قول زیادہ راجح اور مختار ہے۔

غرغرہ کے وقت ایمان لانا

اہل سنت والجماعت کے نزدیک غرغرہ کے وقت کا ایمان لانا معتبر نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں آدمی اپنے اختیار سے ایمان نہیں لاتا اور نہ ہی یہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ کیونکہ عالم برزخ کا مشاہدہ اس کو ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ قبول ایمان کے لئے اپنے اختیار سے ایمان لانا شرط ہے۔ اس لئے ایسا ایمان معتبر نہیں۔ ایسے ایمان کو ''ایمان بأس'' اور ''ایمان یأس'' بھی کہتے ہیں۔ بعض حضرات ایمان عند الغرغرہ کے مقبول ہونے کے قائل ہیں لیکن ان کے دلائل نہایت ضعیف اور رکیک ہونے کی وجہ سے ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔

ہماری دلیل...... قرآن کریم کی آیت: ''ولیست التوبة للذین یعملون السیات حتی اذاحضر احدھم الموت قال انی تبت الآن(نساء)'' ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو برے کام کرتے رہیں اور جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، نیز حدیث نبوی ہے ''ان اللہ یقبل توبة العبد مالم یغرغر'' (ترمذی: کتاب الدعوات باب فضل التوبۃ) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک کہ وہ حالت غرغرہ میں نہ پہنچ جائے۔ معلوم ہوا کہ جب غرغرہ کی حالت میں پہنچ جاتا ہے تو پھر توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ (فتح الملہم ص ۱۹۵ ج ۱)

فرعون کا ایمان

اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ فرعون کا ایمان معتبر نہیں ہے کیونکہ اس

نے کلمات ایمان حالت غرغرہ میں ادا کئے تھے اور حالت غرغرہ کا ایمان قبول ومعتبر نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر مدلل گزرا۔۔۔مزید......**ہماری دلیل**: آیت کریمہ "**فلم یک ینفعهم ایمانهم لما رأوا بأسنا**" (سورۃ مؤمن پ۲۴) ہے یعنی جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچایا، اور چونکہ فرعون بھی عذاب دیکھنے کے بعد ایمان لایا تھا اس لئے بموجب آیت کریمہ اس کا ایمان بھی اس کے لئے کچھ نافع نہیں ہوگا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ فرعون کا ایمان مقبول ومعتبر ہے، اور انہوں نے اس قبولیت کو آیات قرآن سے مستنبط کیا ہے جن میں سرفہرست شیخ محی الدین ابن العربی کا نام لیا جاتا ہے۔ اور ان کی تائید شراح فصوص، جندی، کازرونی، قیصری، جامی، علی المہائمی، عبداللہ رومی اور محقق دوانی رحمھم اللہ نے کی ہے۔ نیز قائلین کی فہرست میں بعض حنابلہ اور قاضی ابوبکر باقلانی رحمھم اللہ بھی شمار کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کازرونی نے شیخ کی تائید میں ایک رسالہ بنام الجانب الغربی فارسی زبان میں تحریر کیا ہے جس کو انہی کے ایک اور مؤید عربی عالم سید محمد بن رسول نے الجاذب الغیبی کے نام سے عربی زبان میں منتقل کیا ہے، غرضیکہ ان حضرات کی طرف ایمان فرعون کے مقبول ہونے کی نسبت کی جاتی ہے۔ **واللہ اعلم وعلمه اتم**۔ (فیض الباری ص۱۸۸ ج۴ روح المعانی ص۱۸۵ ج۶، فتح الملہم ص۱۹۶ ج۱)

شیخ ابن العربی کی کتاب فتوحات مکیہ میں ایمان فرعون پر متعدد دلائل اور جن آیات سے فرعون کا کفر ثابت ہوتا ہے ان کی تاویلات مذکور ہیں، جن میں کوئی وزن نہیں ہے، ہم یہاں ان کی دلیل پیش کررہے ہیں جس سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے دلائل کس درجہ کے ہیں۔

> دلیل......اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک جگہ بندوں کو یہ بتلایا ہے کہ وہ پریشان حال کی پکار سنتا ہے اور اس کی بلاء کو دفع کرتا ہے۔ اور فرعون سے زیادہ بڑی پریشانی کس کی ہوسکتی ہے جس وقت کہ وہ ڈوب رہا تھا اور ایسی حالت میں اس بیچارے نے اللہ کو پکارا کہ **اٰمنت انه لا اله الا الذی اٰمنت به بنو اسرائیل** (الاٰیۃ) تو کیا اللہ تعالیٰ اس کی پکار کو نہیں سنے گا اور اس کے ایمان کو قبول نہیں کرے گا حالانکہ اس کی رحمت تو اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔ (روح المعانی ص۱۸۶ ج۶)

جواب......فرعون نے یہ کلمات حالت غرغرہ میں ادا کئے تھے اور حالت غرغرہ کا ایمان معتبر

نہیں ہے لیکن وہ حضرات تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کلمات اس نے غرغرہ سے پہلے ادا کئے ہیں، خیر اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں تب بھی اس کا کفر ثابت ہوجائے گا، جس کی وجہ صاحب روح المعانی یوں بیان فرماتے ہیں: **لانا لم نحکم بکفرہ لاجل ایمانہ عندالبأس فحسب بل لما انضم الیہ من انہ لم یؤمن باللہ تعالیٰ ایمانا صحیحًابل کان تقلیدًا محضاً۔** (ترجمہ) کہ ہم صرف ایمان عندالغرغرہ کی وجہ سے اس کے کفر کا فیصلہ نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ (اور بھی وجوہات ہیں مثلاً) یہ کہ وہ اللہ پر صحیح (صریح) ایمان نہیں لایا، بلکہ محض تقلید سے کام لیا ہے۔ یعنی وہ صراحۃً اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا بلکہ بنی اسرائیل کا بیچ میں واسطہ دیکر ایمان کا اقرار کیا ہے کہ: ''**امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرائیل**'' اور یہی تقلید ہے جو کہ قبول نہیں ہوتی، خاص کر فرعون جیسے خبیث عقیدہ رکھنے والے شخص سے تو ویسے بھی معتبر نہیں ہوگی۔ اور اگر اس کو بھی ہم تسلیم کرلیں کہ وہ اللہ پر صحیح ایمان لے آیا تھا، تب بھی اس کا کام نہیں بنتا۔ اس لئے کہ وہ ناقص ایمان لایا تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لایا۔ حالانکہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا بغیر رسول پر ایمان لائے ہوئے کافی نہ ہوگا۔ (حوالہ بالا) اسی کو علامہ آلوسی یوں تحریر فرماتے ہیں کہ: **فالاجماع منعقد علی ان الایمان باللہ تعالیٰ مع عدم الایمان بالرسول لا یصح فلو سلمنا ان فرعون امن باللہ تعالیٰ ایماناً صحیحاً فھو لم یومن بموسیٰ علیہ السلام و لا تعرض لہ اصلافلم یکن ایمانہ نافعًا.** (حوالہ بالا) (ترجمہ) اگر ہم مان بھی لیں کہ (وہ اللہ پر صحیح ایمان لے آیا تھا) تو اجماع اس بات پر منعقد ہوچکا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا رسول پر ایمان لائے بغیر صحیح نہیں ہوگا لہٰذا اگر ہم تسلیم کرلیں کہ فرعون اللہ پر صحیح ایمان لے آیا تھا لیکن وہ موسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان نہیں لایا اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس لئے اس کا ایمان نفع بخش نہیں ہوگا۔

کیا ابو طالب مسلمان ہوچکے تھے؟

اہل سنت والجماعت ابو طالب کے ایمان کے قائل نہیں ہیں، روافض ایمان کے قائل ہیں۔

روافض کی دلیل...... ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے جس کی ابن اسحاق نے تخریج

کی ہے کہ ابو طالب نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے کلمہ پڑھنے سے انکار کردیا پھر اس کے بعد حضرت عباسؓ نے دیکھا کہ وہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دے رہے ہیں تو کان لگایا اور حضور اکرم ﷺ کو آ خر خبر کردی کہ اللہ کی قسم میرے بھائی (ابو طالب) نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس کو پڑھنے کا آپ حکم دے رہے تھے۔ (فتح الملہم:۱/۱۹۷)

جواب...... یہ حدیث ان احادیث صحیحہ کے معارض ہے جن میں ابو طالب کے جہنم میں ہونے کی صراحت موجود ہے اس لئے ان احادیث صحیحہ کو ترجیح دی جائے گی مزید یہ کہ اس حدیث کی سند میں رجل مبہم کا واسطہ بھی موجود ہے جبکہ وہ احادیث قوی الاسناد اور جید الاسناد ہیں۔ (فتح الملہم ص۱۹۷ ج۱)

اہل سنت والجماعت...... کی دلیل وہ تمام احادیث ہیں جن میں ابو طالب کے جہنم میں ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً: ''**عن ابن عباسؓ ان رسول الله ﷺ قال اهون اهل النار عذاباً ابو طالب وهو منتعل بنعلين يغلى منهما دماغه**'' (مسلم:۱/۱۱۵) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہل دوزخ میں سب سے ہلکا عذاب ابو طالب کو ہوگا، اور وہ آگ کی دو جوتیاں پہنے ہونگے جن سے ان کا دماغ کھول رہا ہوگا، یہ حدیث صراحۃ دلالت کررہی ہے کہ ابو طالب بغیر ایمان کے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔

کفار کی نیکیاں انہیں فائدہ دیں گی یا نہیں؟

اسلام لانے کے بعد زمانہ کفر کی نیکیاں معتبر مفید ہوں گی یا نہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... زمانہ کفر کی کوئی نیکی قبول نہیں بلکہ وہ سب لغو ہوگئیں۔

جمہور رحمھم اللہ کہتے ہیں کہ...... اگر وہ صدق دل سے ایمان لے آیا، تو اس کے زمانہ کفر میں کیے ہوئے اچھے کاموں کا اعتبار کیا جائے گا اور وہ ان پر اجر کا مستحق ہوگا۔

دلیل...... حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''**اسلمت على ما اسلفت من خير**'' (مسلم شریف ص۷۶ ج۱) یعنی تم سابقہ اعمال خیر کے ساتھ اسلام میں آئے ہو۔ حدیث مذکور صراحۃ دلالت کررہی ہے کہ کافر کی نیکیاں اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔

سیئات الکفار ...... کفار کی بُرائیاں

یہاں پر یہ مسئلہ ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پچھلے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں یا نہیں؟

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... صرف اسلام قبول کرنے سے زمانہ کفر کے گناہ

معاف نہیں ہوتے بلکہ اس سے قبل گناہوں سے توبہ کرنی ہوگی تب معاف ہوں گے۔
جواب......ان کا یہ ہے کہ اسلام لانے سے قبل توبہ کے کوئی معنی نہیں، اس لئے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے کافر ہے اور اگر کوئی کافر اسلام نہ لائے مگر گناہوں سے توبہ کرتا رہے، تو اس کی توبہ ظاہر ہے کہ قبول نہیں ہوئی، اور نہ ہی اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام قبول کرنے سے پہلے گناہوں سے توبہ کرنا بے فائدہ ہوگا۔
جمہور رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......اسلام لانے سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔
دلیل......دیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا: ''**اما علمت ان الاسلام یهدم ما کان قبله**''۔ (مسلم: ۱/۷۶) یعنی اسلام ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو چکے ہیں۔ یہ صریح دلیل ہے کہ قبول اسلام خود توبہ کے قائم مقام ہے۔ اس لئے الگ سے کسی توبہ کی ضرورت نہیں۔

الكفار مخاطبون بالفروع ام لا؟

کفار سے فروعی مسائل کا مطالبہ ہوگا یا نہیں؟

اس میں سب کا اتفاق ہے کہ کفار ایمان اور عقوبات اور معاملات کے مخاطب ہیں اور یہ کہ کافر پر ایمان لانے کے بعد حالت کفر کی نمازوں کی قضا لازم نہیں، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کفار عبادات کے مخاطب ہیں یا نہیں یعنی قیامت میں ان کو ترکِ عبادات پر مزید عذاب دیا جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں حنفیہ کی تین جماعتیں ہیں۔
پہلی جماعت......بعض مشائخ ماوراء النہر اور مشائخ سمرقند کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کفار فروع کے نہ تو اعتقاد رکھنے کے مخاطب ہے (کہ یہ چیزیں فرض ہیں) اور نہ ہی ادا کرنے کے۔
دوسری جماعت......بعض دوسرے مشائخ ماوراالنہر اور مشائخ بخارا کی ہے، یہ کہتے ہیں کہ اعتقاد رکھنے کے مکلّف ہیں ادا کرنے کے مکلّف نہیں ہیں۔
تیسری جماعت......احنافِ عراق کی ہے جو کہ شافعیہ و مالکیہ کے ساتھ ہے، یہ فرماتے ہیں فروعات کی فرضیت کا اعتقاد رکھنے اور ان کو ادا کرنے، دونوں کے مکلّف ہیں۔
دلیل......حنفیہ میں سے وہ دو جماعتیں جو کفار کو اداءِ فروع کے مکلّف نہیں

مانتیں، یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر کفار نماز، روزہ وغیرہ ادا کرنے کے مکلّف ہوتے تو ان کے ادا کرنے سے یہ چیزیں ادا ہو جانی چاہئیں۔ حالانکہ کافر اگر نماز روزہ ادا کرے تو ادا نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ان چیزوں کے مکلّف نہیں ہیں۔

جواب...... یہ ہے کہ عدم صحت سے عدم تکلیف لازم نہیں آتی یعنی ان کے ادا کرنے سے اگر یہ چیزیں ادا نہیں ہوتیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان کے مکلّف بھی نہیں ہیں۔ جیسا کہ جنبی شخص اگر حالت جنابت میں نماز ادا کرے، تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نماز کا مکلّف بھی نہیں ہے بلکہ وہ مکلّف ہے۔ اسی طرح کفار کے ادا کرنے سے اگرچہ یہ چیزیں ادا نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی وہ ان کے مکلّف ہیں۔

دلیل...... جمہور رحمھم اللہ احناف عراق اور شوافع و مالکیہ کی دلیل یہ ہے کہ اگر کفار فروع کے اعتقاد واداء کے مکلّف نہ ہوتے، تو ان کے ادا نہ کرنے پر وعیدیں نازل نہ ہوتیں، حالانکہ قرآن کریم میں ہے: "وویل للمشرکین o الذین لا یؤتون الزکوٰۃ" (حم السجدۃ پ۲۴) اسی طرح فلا صدّق ولا صلّٰی (قیامۃ پ۲۹) اور نہ ہی ان کو عبادت کرنے کا حکم دیا جاتا حالانکہ وارد ہے یاایھا الناس اعبدو اربکم (سورۃ البقرۃ) یہاں الناس میں وہ کفار بھی شامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ کفار فروع کے مخاطب اور مکلّف ہیں اور یہی مذہب حق ہے۔

رؤیۃ اللّٰہ تعالیٰ

جاننا چاہئے کہ محل کے اعتبار سے رؤیت تین قسم پر ہے۔ (۱) رؤیت فی المعراج۔ (۲) رؤیت فی الدنیا۔ (۳) رؤیت فی الاٰخرۃ اور تینوں میں اختلاف منقول ہے۔

(۱) الرؤیۃ فی المعراج

شبِ معراج دیدارِ خداوندی

اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج میں دیدارِ خداوندی سے مشرف ہوئے یا نہیں، اور اگر رؤیت ہوئی تو وہ رؤیت بصری تھی یا رؤیتِ قلبی تھی، یعنی سر کی آنکھوں سے دیکھا یا دِل کی آنکھوں سے دیدار کیا۔ حضرت عائشہؓ رؤیت بصری کا انکار

کرتی تھیں اور حضرت ابن عباسؓ رؤیت کو ثابت کرتے تھے جمہور صحابہ اور تابعین کے نزدیک یہی قول راجح ہے۔

حضرت عائشہؓ کی دلیل ...... ''لا تدركه الابصار'' (سورۃ الانعام پ ۷) یعنی آنکھیں اس کو نہیں پا سکتیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دوسری جگہ ارشاد فرماتی ہیں: ''من زعم ان محمداً صلى الله عليه وسلم رأى ربه فقد اعظم على الله الفرية''۔ (مسلم شریف ص ۹۸ ج ۱، کتاب الایمان) جس شخص نے یہ خیال کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے۔ تو اس نے اللہ پر بڑا جھوٹ باندھا۔

جواب ...... آیت مذکور میں تدرک، تحیط کے معنی میں ہے۔ (فتح الملہم ص ۳۳۹ ج ۱) اور معنی یہ ہے کہ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اور اس کے سبھی قائل ہیں۔ اس لئے یہاں ادراک کو رؤیت کے معنی میں لینا درست نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی دلیل ...... حدیث مرفوع ''لقد رأيت ربي عز وجل'' (مستدرک حاکم عن ابن عباس مرفوعا) ہے یعنی بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے۔

(۲) الرؤية في الدنيا

معتزلہ وخوارج کہتے ہیں کہ ...... دنیا میں رؤیت ممکن نہیں۔ (فتح الملہم ص ۳۴۲ ج ۱)

دلیل ...... کسی چیز کی رؤیت کیلئے چند شرائط ہیں: (۱) وہ چیز زیادہ دور نہ ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہیں اس لئے کہ وہ مستوی علی العرش ہیں اور عرش ہماری نگاہوں سے دور ہے۔ (۲) وہ چیز زیادہ قریب بھی نہ ہو۔ حالانکہ دوسری جہت سے اللہ تعالیٰ ہم سے بہت زیادہ قریب ہیں جیسا کہ خود فرمایا ہے کہ ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ [سورۃ الحاقہ] (۳) شئی مرئی کسی مکان یا جہت میں ہو۔ حالانکہ وہ مکان یا جہت میں ہونے سے پاک ہے اس لئے کہ یہ جسم کا خاصہ ہے اور وہ جسم نہیں۔ (۴) وہ چیز سامنے ہونی چاہئے، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سامنے نہیں۔ (۵) دیکھنے والے کی نگاہ سے نکلنے والی شعاعیں اس چیز سے ٹکرا کر واپس آ جائیں۔ یہ شرط بھی باری تعالیٰ کی رؤیت

میں مفقود ہے اور جب یہ تمام شروط باری تعالیٰ کی رؤیت میں مفقود ہیں تو پھر اس کی رؤیت کیسے ممکن ہوسکتی ہے معلوم ہوا کہ اس کی رؤیت ممکن نہیں ہے۔

جواب...... مذکورہ بالا تمام شروط عادیہ ہیں لازمہ نہیں ہیں اس لئے ان کے بغیر بھی رؤیت ممکن ہوسکتی ہے۔

علماء اہل سنت والجماعت فرماتے ہیں کہ...... دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے۔

دلیل...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے درخواست کی تھی "رب ارنی انظر الیک" (سورۃ الاعراف پ۹) کہ اے پروردگار مجھے اپنا دیدار کرادے میں آپ کے دیدار کا خواہشمند ہوں۔ یہ اس بات پر صریح دلیل ہے کہ باری تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے۔ اس لئے کہ اگر رؤیت ممکن نہ ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست دو حال سے خالی نہیں، یا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ رؤیت محال ہے بس اچانک درخواست کر بیٹھے، اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ اس سے ناواقف تھے کہ جناب باری میں کون سی بات جائز اور ممکن ہے کون سی بات ناجائز اور ناممکن ہے۔ کس چیز کا مطالبہ کرنا چاہئے کس چیز کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رؤیت کے محال ہونے کا علم تھا، تو ان کی یہ درخواست فعل عبث اور طلب محال ہوگی اور وہ ان مذکورہ دونوں باتوں سے پاک تھے۔ معلوم ہوا کہ رؤیت ممکن ہے۔ (فتح الملہم ص۳۴۲ ج۱)

(۳) الرّؤیة فی الاٰخرة

آخرت میں دیدارِ خداوندی

معتزلہ وخوارج...... کہتے ہیں کہ آخرت میں بھی باری تعالیٰ کی رؤیت ممکن نہیں ہے۔

دلیل......"لا تدرکه الابصار" (الآیۃ) وغیرہ (اس کا جواب گزر چکا ہے)۔

اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ...... مومنین کو آخرت (جنت) میں اپنے پروردگار کا دیدار ہوگا اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ (فتح الملہم ص۳۴۲ ج۱)

دلیل...... "وجوہ یومئذنا ضرة الی ربها ناظرة" (سورۃ قیمہ) یعنی اس دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اور اپنے پروردگار کو دیکھیں گے نیز حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "انکم سترون ربکم کما ترون القمر لیلة

البدر ''(ترمذی شریف:۲/۸۲) کہ بلاشبہ تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودہویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات واحادیث صحیحہ سے جنت میں رؤیت کا ثبوت ملتا ہے۔

الحدود کفارۃ ام لا؟

شرعی حدود گناہوں کے لیے کفارہ ہیں یا نہیں؟

کیا حد لگنے سے ہی گناہ معاف ہو جاتا ہے یا اس کے بعد توبہ کی بھی ضرورت ہے؟

اس میں دو مذہب ہیں:

جمہور وائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... حد لگنے کے بعد توبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حد ہی سے گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ یعنی حدود کفارات ہیں۔

دلیل...... حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''فھو کفارۃ لہ (ای کفارۃ ذنبہ)'' (ترمذی کتاب الحدود، بخاری کتاب الایمان) یعنی حد ہی اس کے گناہ کا کفارہ ہے معلوم ہوا کہ الگ سے توبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب...... (۱) حدیث میں ''فھو کفارۃ لہ'' میں ''اِن تاب'' کی قید ملحوظ ہے ورنہ نصوص میں تعارض ہو جائے گا۔ (۲) احناف کے آنے والے دلائل قطعی ہیں اور حدیث عبادہؓ خبر واحد ظنی۔ (۳) اگر مجرم خود اعتراف کر لے اور اپنے آپ کو حد کے لیے پیش کر دے جیسے حضرت ماعز اسلمیؓ تو اس کی حد ساتر و کفارہ ہوگی کیونکہ اس کے ضمن میں توبہ موجود ہے اور اگر اعتراف نہ کرے تو صرف زاجر۔

احنافؒ فرماتے ہیں کہ...... حد لگنے سے صرف دنیا میں جرم ختم ہو جاتا ہے یعنی اب اس کو دنیا میں زانی یا سارق کہہ کر پکارنا جائز نہیں ہے لیکن آخرت میں ابھی گناہ باقی ہے۔ اس لئے وہاں معاف کرانے کے لئے توبہ کی ضرورت ہے۔

دلیل...... (۱): آیت کریمہ ''السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما'' (المائدہ پ۶) کے بعد اگلی آیت میں ارشاد ہے: ''فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب عليه''۔ (۲) ''والذين يرمون المحصنات ثم لم

یـأتوا ......" (سورۃ النور پ۱۸) ان جیسی تمام آیتوں میں حد لگنے کے بعد توبہ کا ذکر ہے اگر حد کفارہ ہے تو پھر اس کے بعد توبہ کے ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ (۳) سورۂ مائدہ میں حد ذکر کرنے کے بعد فرمایا: **ذالک لهم خزی فی الدنیا ولهم فی الأخرة عذاب عظیم** ۔ معلوم ہوا کہ حدود زواجر ہیں کفارات نہیں۔ (۴) حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آکر آپ ﷺ کے سامنے چوری کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے قطع ید کا حکم فرمایا، اور اس کے بعد آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "قل استغفر الله واتوب الیه" اور خود بھی اس کی توبہ کی قبولیت کے لئے اللہ سے دعا فرمائی "اللهم تب علیه" (ابوداؤد ج۲، کتاب الحدود باب التلقین فی الحد، النسائی باب تلقین السارق) معلوم ہوا کہ صرف حد گناہ معاف ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد توبہ بھی ضروری ہے۔ ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص سے حد لگنے کے بعد استغفر اللہ واتوب الیہ نہ کہلواتے۔

کتاب الطھارۃ

طھارۃ الماء ونجاستہ

اگر کسی پانی میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے پاک ہے یا ناپاک ہے؟

ظاہریہ کہتے ہیں کہ...... پانی قلیل ہو یا کثیر نجاست کے گرنے سے اس وقت تک ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ نجاست اس پر غالب نہ آجائے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ...... اگر پانی قلیل ہو یا کثیر نجاست گرنے سے اس وقت تک ناپاک نہیں ہوتا، جب تک کہ پانی کے اوصاف ثلثہ (رنگ، بو، مزہ) میں سے کوئی ایک وصف تبدیل نہ ہو جائے۔

ائمہ ثلاثہ رحمھم اللہ فرماتے ہی کہ...... اگر پانی قلیل ہو تو نجاست گرنے سے فوراً ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر کثیر ہو تو اس وقت تک ناپاک نہیں ہوتا جب تک کوئی ایک وصف نہ بدل جائے۔ پھر ائمہ ثلاثہ رحمھم اللہ کے درمیان قلیل وکثیر کے معیار میں اختلاف ہے کہ آیا قلیل پانی کی مقدار کیا ہے اور کثیر کی کیا ہے۔ یعنی کتنے پانی کو قلیل کہا جائے گا اور کتنے کو کثیر۔

امام شافعی وامام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... جو پانی قلتین سے کم ہو وہ قلیل ہے اور جو مقدار قلتین یا قلتین سے زائد ہو وہ کثیر ہے۔

احناف رحمھم اللہ احناف کے نزدیک...... چونکہ شریعت کی طرف سے پانی کی قلّت و کثرت کا کوئی معیار مقرر نہیں۔اس لئے تین قول ہیں: پہلے دو قول امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہیں اور تیسرا قول متأخرین احناف کی طرف۔(۱) مبتلیٰ بہ کی رائے کا اعتبار ہے۔مبتلیٰ بہ قلیل سمجھے تو قلیل اور کثیر سمجھے تو کثیر۔(۲) اگر اتنا پانی ہو کہ ایک طرف حرکت دینے سے دوسری طرف حرکت ہو جائے تو وہ قلیل ہے ورنہ کثیر۔(۳) دہ در دہ ہو تو کثیر ورنہ قلیل۔(بحر الرائق ج۱، احکام القرآن ج۴)

تنبیہ...... دہ در دہ کی تحدید امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب نہیں ہے بلکہ متأخرین احناف نے عوام کی فہم و سہولت کے لئے یہ قول اختیار کیا ہے۔(فتاویٰ رشیدیہ)

دلیل امام مالکؒ...... حدیث بیر بضاعہ "ان الماء طھور لا ینجسہ شئی" (ترمذی کتاب الطھارۃ) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، اس حدیث میں ماء قلیل و کثیر کی کوئی تفریق نہیں ہے ہر پانی کے بارے میں یہی کہا گیا ہے کہ وہ ناپاک نہیں ہوتا ہے، اور یہی ہمارا بھی کہنا ہے کہ صرف نجاست کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر، اور رہی تغیر وصف کی قید تو وہ ہم نے اس لئے لگائی ہے کیونکہ اسی حدیث میں (دارقطنی میں) یہ الفاظ زائد ہیں: **الا ما غلب علی طعمہ او لونہ او ریحہ۔**

جواب...... آپ کا یہ حکم کہ "ان الماء طھور لا ینجّسہ شئی" بیر بضاعہ کے ساتھ خاص تھا اور بیر بضاعہ کا پانی کثرت استعمال کی وجہ سے ماء جاری کے حکم میں تھا اور ماء جاری وقوع نجاست سے ناپاک نہیں ہوتا۔اس لئے اس حدیث سے دوسرے پانیوں کے بارے میں بھی یہی حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

دلیل امام شافعیؒ وامام احمدؒ...... یہ حضرات حدیث قلّتین کو پیش کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اذا کان الماء قلّتین لم یحمل الخبث" (ترمذی کتاب الطھارۃ) کہ جب پانی دو قلہ ہو تو نجاست سے متأثر نہیں ہوتا کہ دو قلہ پانی کثیر ہے اور اس سے کم قلیل ہے۔

جواب...... حدیث قلّتین کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مثلاً (۱) یہ حدیث مضطرب ہے اس کی سند اور متن دونوں میں اضطراب ہے۔(۲) مجمل ہے کیونکہ قلہ کے بہت سے معانی آتے ہیں (جیسے آدمی کا قد، پہاڑ کی چوٹی، مٹکا وغیرہ) اور معلوم نہیں کہ حدیث میں

کون سے معنی مراد ہیں۔ (۳) یہ حدیث مؤول ہے یعنی اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر پانی اتنا ہو تو نجاست سے متأثر ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر پانی دو قلہ ہو تو نجاست کو برداشت نہیں کر پاتا (ناپاک ہوجاتا ہے)۔

دلیل احناف...... (۱): حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: **لا یبولن احدکم فی الماء الدائم** (بحوالہ مذکور) اس حدیث میں ماءدائم میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ پیشاب کر کے اس کو ناپاک نہ کیا جائے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً ماءدائم میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا اب وہ ماءدائم قلتین بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی۔ معلوم ہوا کہ قلتین قلت و کثرت کا معیار نہیں ہے اس لئے کہ اگر وہ کثیر ہوتا تو ناپاک نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا استثناء فرماتے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنیٰ نہیں فرمایا ہے۔ (۲): ''**اذا استیقظ احدکم من نومه فلا یغمس یده فی الاناء**'' (مسلم کتاب الطہارۃ) اس حدیث میں سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بغیر دھلے ہاتھ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، مقصد یہی ہے کہ ہوسکتا ہے ہاتھ پر کچھ نجاست لگی ہو۔ بغیر دھلے ہاتھ ڈالنے سے وہ نجاست پانی میں چلی جائے اور پانی ناپاک ہوجائے۔ اب غور فرمائیے جب نجاست کے احتمال کی وجہ سے پانی میں بغیر دھلے ہاتھ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے تو عین نجاست سے بدرجہ اولیٰ پانی ناپاک ہوجائے گا۔

حکم حیوانات البحر

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... خنزیر کے علاوہ سمندر کے سب جانور حلال ہیں۔

دلیل...... خنزیر کے حرام ہونے پر آیت کریمہ: ''**حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر**'' (سورۃ المائدہ) کو پیش کرتے ہیں اور باقی جانوروں کی حلت پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ''**احل لکم صید البحر**'' (سورۃ المائدہ) اور صید یہاں مطلق ہے جس میں سے کسی کا استثناء نہیں کیا گیا ہے اس لئے بجز خنزیر کے سارے سمندری جانور حلال ہوں گے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہاں صید کے معنی جانور کے نہیں ہیں بلکہ صید مصدری معنی میں ہے یعنی شکار کرنا، اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے سمندر میں شکار کرنا جائز ہے، رہا مسئلہ

جانوروں کا کہ کن کا شکار کرنا جائز ہے اور کن کا نہیں تو آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ شکار کرنا جائز ہے، اس لئے اس آیت کریمہ سے سمندری جانوروں کی حلت ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک.....سوائے ضفدع (مینڈک) کے تمام بحری جانور حلال ہیں۔

دلیل.....ضفدع کی حرمت اس حدیث سے مستنبط کی ہے جس میں ضفدع کے مارنے پر نہی وارد ہوئی ہے۔ اور بقیہ جانوروں کی حلت پر ایک دلیل تو وہی دیتے ہیں جو مع جواب کے اوپر گزری (احل لکم صید البحر)۔ دوسری دلیل حدیث شریف ''الحل میتتہ'' (ترمذی ج۱ باب ماء البحر انہ طھور) پیش کرتے ہیں۔ کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے مردار جانوروں کو حلال فرمایا ہے۔

جواب.....حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ''الحل میتته'' کا نہایت آسان جواب مرحمت فرمایا ہے وہ یہ کہ الحل سے مراد حلال نہیں ہے جس سے آپ میتۃ کی حلت ثابت کر رہے ہیں، بلکہ یہاں الحل، الطاہر کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ سمندر کا میتۃ پاک ہوتا ہے (یعنی نجس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے پانی کے پاک ناپاک ہونے میں شبہ کیا جائے)۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ.....سوائے ضفدع، تمساح اور کوسج کے تمام بحری جانور حلال ہیں، دلائل تقریباً وہی ہیں جو ماقبل میں گزرے۔ (راجع للتفصیل میزان کتاب الاطعمہ: ۵۲/۲ للشعرانیؒ)

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ.....سمندر کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اور باقی سارے جانور حرام ہیں اور مچھلی بھی غیر طافی ہونی چاہئے، اگر طافی ہو (یعنی اپنی طبعی موت مر کر اوپر آ گئی ہو) تو وہ بھی حرام ہے۔ (کمافی ابوداؤد ص۳۲ ج۲، وابن ماجہ ص۳۳۴)

دلیل.....(۱) آیت کریمہ ''ویحرّم علیھم الخبائث'' (سورۃ الاعراف، پ۹) یعنی ان پر خبیث چیزیں حرام کردی گئیں ہیں اور مچھلی کے علاوہ سمندر کے باقی سارے جانور خبیث ہیں، اس لئے کہ خبیث کہتے ہیں جس سے طبیعت انسانی گھن کرتی ہو اور مچھلی کے علاوہ سمندر کے باقی جانوروں سے طبیعت گھن محسوس کرتی ہے، اس لئے سب خبائث میں داخل ہیں۔ (۲): ''حرّمت علیکم المیتة'' (المائدہ پ۶) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر میتۃ حرام ہے، سوائے اس میتۃ کے جس کی تخصیص دلیل شرعی سے

ثابت ہوگئی ہو۔ اور وہ سمندری جانوروں میں صرف مچھلی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: احلّت لنا المیتتان السمک و الجراد اور سمک طافی کا استثناء ابوداؤد کی اس حدیث سے کیا ہے جس میں ہے: ''وما مات فیه و طفا فلا تأکلوه'' کہ جو سمندر میں طبعی موت مر کے اوپر آ جائے اس کومت کھاؤ۔

الماء المستعمل

ماء مستعمل (یعنی وضوء اور غسل جنابت میں اعضاء پر بہہ کر نیچے گرنے والا پانی) طاہر (پاک) اور مطہر (پاک کرنے والا) ہے یا نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... ماء مستعمل طاہر و مطہر ہے۔

دلیل...... قرآن کریم میں پانی کو طہور فرمایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: و انزلنا من السماء ماءً طهوراً (سورۃ الفرقان پ۱۹) اور طہور فعول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بار بار پاک کرنے والا، جیسے قطوع بار بار کاٹنے والا اس لئے اگر کسی پانی سے ایک بار نجاست حکمیہ کا ازالہ کیا گیا ہے تو وہ اس کے بعد بھی مطہر رہے گا، اور اس سے دوبارہ بھی پاکی حاصل کی جاسکتی ہے جیسا کہ خود لفظ طہور کے معنی بتلا رہے ہیں، اور جو چیز مطہر ہوگی وہ طاہر بھی ضرور ہوگی پس ثابت ہو گیا کہ ماء مستعمل طاہر و مطہر ہے۔

جواب...... یہاں طہور مبالغہ کا صیغہ ہے یہ تو صحیح ہے مگر مبالغہ سے مراد یہاں مبالغہ فی الفعل (یعنی بار بار پاک کرنے والا) نہیں ہے بلکہ مبالغہ فی الوصف (یعنی خوب خوب پاک کرنے والا) مراد ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... ماء مستعمل طاہر تو ہے لیکن مطہر نہیں ہے۔ اور حنابلہ وحنفیہ کا بھی مفتی بہ قول یہی ہے۔

دلیل...... حضور اکرم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں جس طرح پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے اسی طرح غسل جنابت کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

چنانچہ فرمایا: لایبولن احدکم فی الماء الدائم ، ولا یغتسل فیه من الجنابة ۔ (ابوداؤد کتاب الطہارۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت کے بعد وہ پانی (ماء مستعمل) دوبارہ استعمال کے قابل نہیں رہتا، اور پانی کے اوصاف میں نقصان آ جاتا ہے، تب ہی تو حضور اکرم ﷺ نے اس میں غسل کرنے سے

منع فرمایا ہے ورنہ اگر کوئی نقصان نہ آتا اور وہ پہلے ہی کی طرح طاہر و مطہر رہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غسل کرنے سے کیوں منع فرماتے۔

سؤر الکلب

(۱) کتے کا جھوٹا پاک ہے یا ناپاک؟

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... کتے کا جھوٹا پاک ہے، لیکن جس برتن میں کتا منہ ڈال دے اس کو دھونا ان کے نزدیک واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... کتے کا جھوٹا نجس ہے، اور ایسے برتن کا دھونا واجب ہے۔

دلیل...... وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **طهور اناء احدكم اذا ولغ فيه الكلب ان يغسله سبع مرات** (ابوداؤد:۱/۱۰، ومسلم ۱/۱۳۷) کہ تمہارے اس برتن کی پاکی جس میں کتا منہ ڈال دے یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھولو۔ اس میں برتن کو دھونے کا حکم پاکی کے لئے ہے، اور پاک اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو ناپاک ہو، معلوم ہوا کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، اور جس برتن میں وہ منہ ڈال دے وہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

كيفية تطهير الاناء من سؤر الكلب

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو کتنی مرتبہ دھویا جائے گا؟

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... سات مرتبہ دھونا واجب ہے جس میں سے ایک مرتبہ تتریب (مٹی سے رگڑنا) بھی شامل ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... سات مرتبہ دھونا واجب ہے۔ اور تتریب مستحب ہے۔

دلیل...... ائمہ ثلاثہ کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **يغسل الاناء اذا ولغ فيه الكلب سبع مراتٍ** (ترمذی:۱/۲۷) کہ جس برتن میں کتا منہ ڈال دے اس کو سات مرتبہ دھویا جائے۔ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ: فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونا ضروری ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث مذکور میں سات مرتبہ دھونے کا حکم وجوب کے لئے نہیں ہے، بلکہ استحباب کیلئے ہے، کیوں کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں، اور حضرت ابو

ہریرہؓ کا فتویٰ و عمل خود اس حدیث کے خلاف ہے (دارقطنی ص۲۴ ج۱، ط: فاروقی دہلی) جو کہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس حدیث میں مذکور سات مرتبہ دھونے کا حکم وجوب کیلئے نہیں ہے، ورنہ راوی خود اس پر عمل کرتے، اس کے خلاف عمل نہ کرتے، اور نہ ہی اس کے خلاف فتویٰ دیتے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... آٹھ مرتبہ دھونا ضروری ہے جس میں آخری مرتبہ مٹی سے رگڑنا بھی ضروری ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی وہ روایت ہے جس میں ہے کہ: **اذا ولغ الکلب فی الاناء فاغسلوہ سبع مرات وعفروہ الثامنۃ بالتراب** ۔ (مسلم: ۱/۳۷، ابوداؤد: ۱/۱۰) کہ جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات مرتبہ دھولو اور آٹھویں مرتبہ مٹی سے رگڑو۔

جواب...... یہ امر استحبابی ہے، اور اس کی تاکید اس وقت زیادہ تھی جب کتوں کے معاملہ میں سختی کی جارہی تھی یہاں تک کہ ان کے قتل کرنے کا حکم بھی دیدیا گیا تھا، بعد میں یہ سختی اٹھالی گئی، جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تین مرتبہ دھونے کا حکم بتلارہا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... کتے کے جھوٹے برتن کو تین مرتبہ دھونا واجب ہے اور سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔

دلیل...... ان کا مستدل بھی حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **اذا ولغ الکلب فی اناء احدکم فلیھرقہ ولیغسلہ ثلاث مرات** ۔ (نصب الرایہ: ۱/۱۳۱ والعینی: ۱/۱۷۴) کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اس (چیز) کو بہادو اور اس (برتن) کو تین مرتبہ دھولو۔ اس سے کم عدد احادیث میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے کہا کہ کم از کم تین مرتبہ دھونا واجب ہے، اور سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔

سور الھرّۃ

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... بلی کا جھوٹا نجس وناپاک ہے۔

دلیل...... وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**السنور سباع**'' بلی درندہ جانور ہے، اور یہ معلوم ہے کہ درندے جانوروں کا جھوٹا ناپاک ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ (نصب الرایہ ص۱۳۴ ج ۱، و ص ۱۳۵)

ائمہ ثلاثہؒ و امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ...... بلی کا جھوٹا بلا کراہت پاک ہے۔

دلیل...... حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''انها ليست بنجس انما هي من الطوافين عليكم'' کہ بلی ناپاک نہیں ہے، کیونکہ وہ تمہارے پاس گھومتی رہتی ہے۔ (ابو داؤد: ۱/۱۱) اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے بلی کے نجس ہونے کی نفی فرمائی ہے، معلوم ہوا کہ بلی پاک ہے اور جو چیز پاک ہو اس کا جھوٹا بھی پاک ہوگا۔

جواب...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا اور اپنے برتن سے اگر بلی کو کبھی کچھ کھلایا پلایا تو یہ سب بیان جواز اور لوگوں کے دلوں سے اس کے نجس ہونے کے وہم کو نکالنے کے لئے تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلی کو اپنے برتن سے پانی پلانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مکروہ تنزیہی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکروہ تنزیہی پر عمل کرنا بیان جواز کیلئے کبھی ثابت ہے۔ (معارف السنن ص ۳۲۰، ج ۱)

امام اعظم و محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... بلی کا جھوٹا مکروہ ہے، مگر کراہت کس درجہ کی ہے؟ تو امام طحاوی فرماتے ہیں کہ کراہت تحریمی ہے، اور امام کرخی سے کراہت تنزیہی منقول ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

دلیل...... حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''طهور الاناء اذا ولغ فيه الهرّان يغسل مرةً او مرتين'' کہ تمہارے برتن کی پاکی جب اس میں بلی منہ ڈال دے یہ ہے کہ اس کو ایک یا دو مرتبہ دھویا جائے (طحاوی ص ۱۸) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلی کا جھوٹا مکروہ ہے، اس لئے کہ اگر کوئی کراہت نہ ہوتی، تو دھونے کا بالکل حکم نہ دیا جاتا، نیز اوپر مذکورہ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث میں آپ ﷺ نے بلی کے عدم نجس ہونے کی علت طواف کو قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے نجس ہے، مگر عموم بلویٰ اور کثرت اختلاط کی وجہ سے اجازت دی گئی ہے اور یہ علت خود کراہت تنزیہی پر دلالت کرتی ہے۔

مزيل النجاسة

کیا پانی کے علاوہ دوسری بہنے والی چیزوں سے بھی نجاست کو زائل کیا جاسکتا ہے؟

جمہورؒ فرماتے ہیں کہ...... پانی کے علاوہ دوسری مائعات سے نجاست کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......ازالۂ حدث کیلئے تو پانی متعین ہے، لیکن نجاست حسّیہ کا ازالہ پانی کے علاوہ سے بھی جائز ہے۔

دلیل......حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جس میں تھوک سے دم حیض کو چھڑانے کا ذکر ہے۔ (ابوداؤد شریف ص۵۲ ج۱)

بول الصبی قبل الطعام

کھانا کھانے سے بچہ کا پیشاب

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......اگر شیر خوار بچہ پیشاب کردے تو اس پر چھینٹیں مارنے سے کپڑا پاک ہوجاتا ہے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔

دلیل......عن ام قیس بنت محصنؓ قالت دخلت بابن لی علی النبی ﷺ لم یا کل الطعام فبال علیه فدعا بماء فرشّه علیه ۔ (ترمذی:۱/ ۳۸، وابوداؤد ج:۱، باب بول الصبی یصیب الثوب) یعنی بچے نے آپ ﷺ کی گود میں پیشاب کردیا تو آپ ﷺ نے پانی منگا کر اس پر چھینٹیں ماردیں، اس کے علاوہ وہ ساری احادیث بھی ان حضرات کا مستدل ہیں جن میں بول غلام کے سلسلہ میں نضح یارش (چھینٹیں مارنے) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

جوابِ امام شافعی رحمہ اللہ...... یہ ہے کہ چونکہ دوسری احادیث میں پانی بہانے وغیرہ کے الفاظ موجود ہیں اس لئے نضح اور رشّ کے بھی ایسے معنی مراد لئے جائیں گے۔ جو دوسری روایات کے مطابق ہوں اور وہ غسل خفیف ہیں، نیز خود امام شافعی رحمہ اللہ نے بعض مقامات پر ان الفاظ کی یہی تشریح کی ہے۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......بول جاریہ کی طرح بول غلام کا بھی غسل ضروری ہے البتہ غسل میں مبالغہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ غسل خفیف کافی ہے۔

دلیل......عن عائشۃؓ قالت کان رسول اللہ ﷺ یؤتیٰ

بالصبیان فأتی بصبی مرّةً فبال علیه فقال صبّوا علیه الماء صبًّه
کہ آپ ﷺ کے پاس بچے لائے جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک بچہ لایا گیا تو اس نے آپ ﷺ کے اوپر پیشاب کردیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر اچھی طرح پانی بہادو نیز وہ تمام احادیث بھی ہماری مستدل ہیں جن میں پیشاب کی چھینٹوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

فائدہ...... یہ اختلاف صرف بول صبی میں ہے، صبیہ کے پیشاب میں بالاتفاق دھونا لازم ہے۔

تطهیر الارض من النجاسة

نجاست لگنے سے زمین کی پاکی کا طریقہ

اگر نجاست کے اجزاء زمین میں سرایت کرنے والے نہ ہوں تو نجاست کے زائل کرنے سے زمین بالاتفاق پاک ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر نجاست کے اجزاء زمین میں سرایت کر جائیں تو اس کے طریقہ تطہیر میں اختلاف ہے چنانچہ......

جمہور ائمہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... ایسی زمین صرف پانی بہانے سے پاک ہوگی۔

دلیل...... وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد نبوی میں آ کر پیشاب کردیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم فرمایا: **صبوا علیه سجلا من ماء** ۔ (ابوداؤد شریف ص۵۴ ج۱) کہ اس پر ایک ڈول پانی بہادو، معلوم ہوا کہ تطہیر ارض کے لئے پانی بہانا ضروری ہے اس لئے صرف جفاف وغیرہ سے زمین پاک نہیں ہوگی۔

جواب...... یہ کہنا کہ صرف اہراق ماء سے ہی زمین پاک ہو جاتی ہے، غلط ہے اس لئے کہ احادیث میں دوسرے طریقے بھی مذکور ہیں چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے حفر اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سے جفاف کے ذریعہ طہارت حاصل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... تطہیر ارض کے تین طریقے ہیں اور تینوں کا ثبوت احادیث میں ملتا ہے۔ (۱) صب الماء: اس کا ثبوت اوپر مذکور اعرابی والی حدیث سے ملتا ہے، کیونکہ اس میں صبّ الماء کا ذکر ہے۔ (۲) جفاف (خشک ہو جانا) اس کا ثبوت حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ملتا ہے جس میں یہ ہے کہ ''کانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد فلم یکونوا یرشون شیئاً من ذالک'' (ابوداؤد ص ۵۵ ج۱) کہ کتے مسجد میں آتے جاتے اور پیشاب کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (اس پر پانی وغیرہ) کچھ نہیں چھڑکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ صرف خشک ہونے سے ہی زمین پاک ہوجاتی تھی۔ (۳) حفر (کھودنا)۔ اس کا ثبوت اس حدیث سے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خذ واما بال علیہ من التراب فالقوہ واھریقوا علی مکانہ ماء (ابوداؤد: ۱/۵۴) کہ جس جگہ اس نے پیشاب کیا ہے اس جگہ کی مٹی نکال کر پھینک دو اور اس جگہ پانی بہادو۔ اس حدیث سے حفر کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تطہیر ارض کے تین طریقے ہیں۔

بول مایؤ کل لحمه

امام مالک وامام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... جن جانوروں کا گوشت حلال ہے، ان کا پیشاب پاک ہے۔

دلیل...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں سے ارشاد فرمایا تھا: اشربوا من البانها وابوالها (ترمذی باب بول مایؤ کل لحمه) کہ تم اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ مایوکل لحمہ کا پیشاب پاک ہے اس لئے کہ اگر ان کا پیشاب پاک نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو پیشاب پینے کا حکم نہ فرماتے۔

جواب...... (۱) شرب بول کا یہ حکم ان لوگوں کو بطور علاج دیا گیا تھا، چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بتلا دیا گیا تھا، کہ ان کی شفاء اور زندگی اسی کے پینے میں مضمر ہے، دوسروں کے لئے شرب بول کی اجازت نہیں ہے۔ (۲) یہ لوگ حالت اضطرار میں پہونچ گئے تھے، اور حالت اضطرار میں شئی نجس کا استعمال جائز ہوجاتا ہے۔

امام اعظم وامام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... بول مایوکل لحمہ، نجس ہے۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: ''استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه'' (مستدرک: ۱/۱۸۳، وابن ماجہ: ۱/۲۹، ودارقطنی: ۱/۴۷) یعنی پیشاب سے بچو اس لئے کہ عذاب قبر عام طور پر اسی سے ہوتا ہے۔ دلیل ۲: ایک شخص کی عذابِ قبر کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ

پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوا، نیز جب ان کی بیوی سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مویشی پالتے تھے، اوران کے پیشاب سے زیادہ احتیاط نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب بھی ناپاک ہے۔

مسئلة استقبال القبلة و استدبارها

قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی جانب منہ اور پشت کرنا

اس مسئلہ میں متعدد اقوال ہیں جن میں پانچ زیادہ مشہور ہیں۔

طرفین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... استقبال اور استدبار دونوں مطلقاً ناجائز ہیں، خواہ جنگل میں ہو یا آبادی میں۔

داؤد ظاہری رحمہ اللہ...... دونوں مطلقاً جائز ہیں جنگل ہو یا آبادی۔

امام مالک وشافعی رحمہما اللہ...... صحراء میں دونوں ناجائز اور آبادی میں دونوں جائز۔

امام احمد رحمہ اللہ...... استقبال مطلقاً ناجائز اور استدبار مطلقاً جائز۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ...... استقبال مطلقاً ناجائز اور استدبار صحراء میں ناجائز، آبادی میں جائز۔

دلیل داؤد ظاہریؒ...... حدیث جابرؓ: ''قال نهى نبي الله ﷺ ان نستقبل القبلةببول فرأيته قبل ان يقبض بعام يستقبلها'' (ابوداؤد کتاب الطھارۃ) کہ نبی پاک ﷺ نے قبلہ کی جانب رخ کر کے پیشاب کرنے سے منع فرمایا، پھر آپ ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل میں نے دیکھا کہ آپ قبلہ کا استقبال فرمارہے ہیں۔ تو اس حدیث سے استقبال ثابت ہوتا ہے (اور ابن عمرؓ کی حدیث سے استدبار)۔ اس لئے دونوں مطلقاً جائز ہیں۔

جواب...... حدیث مذکور میں بعض راوی متکلم فیہ ہیں، اس لئے یہ حدیث باب کی دیگر صحیح روایات کا مقابل نہیں بن سکتی، نیز اس میں بھی وہی آگے بیان ہونے والے احتمالات ہیں۔

دلیل امام مالک وشافعی واحمد وابو یوسف رحمہم اللہ...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: ارتقيت علىٰ ظهر بيت حفصة فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم علىٰ حاجته مستقبل الشام مستدبر القبلة. (صحاح ستہ) کہ میں (اپنی بہن) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان کی چھت پر چڑھا تو میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شام کی جانب رخ،

اور کعبہ کی جانب پشت کئے ہوئے قضاء حاجت فرما رہے ہیں، اس حدیث سے آبادی میں استدبار، اور اوپر مذکور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے آبادی میں استقبال ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے آبادی میں دونوں جائز ہوں گے۔

جواب...... (۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بہت زیادہ محتمل ہے۔ مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسی حالت میں قصداً تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب دیکھا نہیں ہوگا، بلکہ اچانک نگاہ پڑی ہوگی، اور اس صورت میں غلطی کا بہت زیادہ امکان ہے۔ (۲) جہت قبلہ کے استقبال واستدبار سے کعبۃ اللہ کی بے حرمتی نہیں ہوتی عین کعبہ کے استقبال واستدبار سے کعبۃ اللہ کی بے حرمتی ہوتی ہے، اور ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عین کعبہ سے منحرف ہوں، لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی نظر فجائی اس کا صحیح ادراک نہ کرپائی ہو۔ (۳) ہوسکتا ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہوں، غرضیکہ اس حدیث میں بہت سارے احتمالات جمع ہوگئے ہیں، اور قاعدہ ہے، **اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال**۔

دلیل طرفین رحمہما اللہ...... حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مرفوع، متصل حدیث ہے: **اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروھا ببول ولا غائط.** (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اس حدیث میں بوقت استنجاء قبلہ کی جانب رخ کرنے اور پشت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ نیز اس میں جنگل یا آبادی کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اس لئے ان دونوں کو عام ہے۔

روایت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی وجوہ ترجیح...... (۱) یہ حدیث باتفاق محدثین باعتبار سند اصح مافی الباب ہے۔ (۲) یہ حدیث ایک قانون کلی کی حیثیت رکھتی ہے باقی واقعات جزئیہ ہیں۔ (۳) یہ روایت قولی ہے اور باقی روایات فعلی ہیں اور عند التعارض قولی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ (۴) یہ روایت محرّم ہے اور محرّم راجح ہوتی ہے مبیح سے۔ (۵) یہ روایت اوفق بالقرآن ہے کئی آیات قرآنیہ شعائر اللہ کی تعظیم پر دال ہیں۔ (۶) یہ روایت مؤید بالقیاس ہے ابن حبان کی ایک روایت میں قبلہ کی طرف تھوکنے پر وعید وارد ہے تو جب تھوکنے کی ممانعت ہے تو عند الحاجۃ استقبال واستدبار کی ممانعت بطریق اولیٰ ہوگی۔

البول قائماً

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مطلقاً جائز ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... اگر چھینٹیں آنے کا اور شرمگاہ پر دوسرے کی نگاہ پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتو بلا کراہت جائز ہے۔

دلیل...... حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں ہے: **اتــــى رسـول الـلّـه صـلـى الـلّـه عـلـيـه وسـلـم سبـا طة قوم فبـال قـائـماً**...... الخ (ابوداؤد ج۱، ترمذی ج۱، بخاری ج۱ واللفظ للاوّل) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کی کوڑی پر آئے اور کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول قائماً بلا کراہت جائز ہے۔

جواب...... (۱) یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پیشاب اس لئے فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے میں تکلیف تھی جس کی وجہ سے بیٹھنا مشکل تھا، جیسا کہ بیہقی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: **فبـال قـائماً لجرح كان في مـابـضـه**، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھٹنے میں زخم کی وجہ سے کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل عذر کی وجہ سے تھا، اس لئے دوسروں کا اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ (۲) حدیث بیانِ جواز پر محمول ہے۔

امام اعظم وشافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... بلا عذر کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مکروہ ہے، حرام نہیں۔

دلیل...... چونکہ متعدد احادیث میں بول قائماً کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی اور دوسروں کے لئے نہی وارد ہوئی ہے اگر چہ وہ احادیث ضعیف ہیں لیکن کم از کم ان سے کراہت تنزیہی ضرور ثابت ہو جائے گی۔ اس لئے بول قائماً کو مطلقاً جائز کہنا درست نہیں ہے۔

نوٹ...... تشبہ بالاغیار کی وجہ سے اس زمانہ میں حرام کا فتویٰ ہے۔

الاستنجاء باليمين

دائیں ہاتھ سے استنجاء

ظاہریہ اور بعض شوافع وحنابلہ کے نزدیک...... استنجاء بالیمین سے طہارت حاصل ہی نہیں ہوتی۔ دلیل: حدیث سلمان فارسیؓ "نهانا...... وأن نستنجئ باليمين"۔

امام اعظمؒ وجمہور فرماتے ہیں کہ...... استنجاء بالیمین مکروہ تحریمی ہے، تاہم طہارت حاصل ہو جائے گی۔

دلیل...... یہ ہے کہ حدیث پاک میں استنجاء بالیمین پر نہی وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اذا بال احدكم فلا ياخذن ذكره بيمينه ولا يستنجي بيمينه۔ (بخاری شریف ص ۲۷ ج ۱) کہ جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو ہرگز اپنے عضو کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے، اور نہ ہی دائیں ہاتھ سے استنجاء کرے، اور اصل مقصد ازالہ حدث ہے جو کسی بھی ہاتھ سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن شریعت نے دائیں ہاتھ کو کرامت وشرف بخشا ہے کمافی حدیث عائشہؓ 'كانت يد رسول الله صلى الله عليه وسلم اليمنىٰ لطهوره وطعامه"۔ (ابوداؤد ص ۵ ج ۱)

عدد الاحجار في الاستنجاء

استنجاء میں کتنے پتھر چاہیے؟

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... استنجاء میں انقاء (مخرج کو خوب اچھی طرح صاف کرنا) اور تثلیث یعنی تین پتھر واجب ہے۔

دلیل...... حضرت سلمان فارسیؓ کی حدیث ہے جس میں نبی پاک ﷺ نے جہاں چند چیزوں سے منع فرمایا ہے وہیں اس بات سے بھی منع فرمایا ہے: ان يستنجي احدنا باقل من ثلثة احجار (ترمذی، کتاب الطہارۃ) کہ ہم میں سے کوئی تین پتھروں سے کم سے استنجاء کرے۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: التمس لي ثلثة احجار، ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث سے تثلیث کا ثبوت ملتا ہے۔ (حوالہ بالا)

جواب...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین پتھروں سے کم کے استعمال سے منع فرمایا ہے، یا اپنے لئے تین پتھر منگوائے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً تین ہی پتھروں سے انقاء ہوتا ہے یہ نہیں کہ تین پتھر واجب ہیں۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تین پتھر نہ مل سکے تھے تو وہ روث (لید) کا ٹکڑا لے آئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نجس فرما کر پھینک دیا اور صرف دو پتھروں پر اکتفاء فرمایا یہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ تین ہی پتھر ضروری نہیں ہیں بلکہ اگر تین سے کم سے بھی انقاء ہوجائے تو جائز ہے، اور جس حدیث میں یہ زیادتی آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روث کو پھینک کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دوبارہ ایک پتھر اور منگوایا، تو یہ زیادتی منقطع ہے اس لئے قابل استدلال نہیں ہے۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... صرف انقاء واجب ہے تثلیث واجب نہیں ہے بلکہ مسنون ہے۔

دلیل...... (۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے: "**من استجمر فلیوتر، من فعل فقد احسن، ومن لا فلا حرج**" (ابوداؤد ص۶ ج۱) کہ جو شخص پتھر سے استنجاء کرے اس کو چاہئے کہ طاق عدد اختیار کرے، جس نے کرلیا بہتر ہے اور جس نے نہیں کیا تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تین پتھر واجب نہیں ہیں اس لئے کہ اگر تین پتھر استعمال کرنا ضروری ہوتا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ نہ فرماتے کہ جس نے نہیں کیا تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ واجب کے ترک میں حرج ہوتا ہے۔ (۲) جن احادیث میں تثلیث کا ذکر ہے ان میں سے بعض میں یہ الفاظ موجود ہیں: **فانها تجزئ عنه** (ابوداؤد ص۶ ج۱، ابن ماجہ ودار قطنی) اور **فان ذلک کافیه** (معجم طبرانی ومجمع الزوائد ص۲۱۱ ج۱) کہ یہ تین پتھر کافی ہوجائیں گے، معلوم ہوا کہ تین کا عدد ضروری نہیں ہے، بلکہ چونکہ انقاء میں تین کافی ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو ذکر کردیا گیا ہے۔ البتہ ایتار مافوق الثلاث سب کے نزدیک مستحب ہے۔

مالایستنجیٰ به

جن چیزوں سے استنجاء درست نہیں

اہل ظواہر کے نزدیک...... شئی نجس (سوکھا گوبر، لید وغیرہ) سے استنجاء معتبر نہیں ہوگا، بلکہ استنجاء کالعدم ہوگا، اس لئے کہ ان چیزوں سے استنجاء کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے۔

دلیل...... حضرت رویفع رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں ہے: ''او استنجیٰ برجیع دابّة اوعظم، فانّ محمداً ﷺ منه برئ'' کہ آپؐ نے فرمایا جو گوبر، لید یا ہڈی سے استنجاء کرے محمد ﷺ اس سے بری ہیں۔ (ابوداؤد:۱/۶) نیز دارقطنی میں ہے: انهما لا یطهّران کہ عظم اور رجیع (ہڈی، گوبر، لید وغیرہ) سے پاکی حاصل نہیں ہوتی۔ (نصب الرایہ:۱/۲۲۰)

جواب...... ان چیزوں سے استنجاء کا تحقق ہی نہیں ہوتا، یہ کہنا غلط ہے، اس لئے کہ کسی فعل پر نہی وارد ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا، کہ اب اس کا تحقق ہی نہیں ہوگا بلکہ تحقق ہوجاتا ہے، البتہ نہی کی وجہ سے کراہت آتی ہے جیسا کہ صوم یوم النحر پر نہی وارد ہوئی ہے، یعنی قربانی کے دن کا روزہ رکھنا حرام ہے مگر کوئی شخص اگر اس دن روزہ رکھ لے تو تحقق ہوجاتا ہے، ایسا ہی یہاں سمجھئے کہ ان چیزوں سے استنجاء کرنا اگرچہ مکروہ ہے، مگر کوئی شخص اگر کرلے تو استنجاء کا تحقق ہوجاوے گا۔ اور دارقطنی کی روایت کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک راوی سلمہ بن رجاء کوفی ہے جو کہ متکلم فیہ ہے۔ (نصب الرایہ ص۲۰۰ ج۱) اس لئے وہ روایت بھی قابل استدلال نہیں ہے۔

جمہورؒ فرماتے ہیں کہ...... شئی نجس اگر یابس (خشک) ہو تو اس سے استنجاء کا تحقق ہوجاتا ہے مگر کراہت کے ساتھ اور اگر وہ گوبر یا لید غیر ماکول اللحم جانور کا ہے تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک استنجاء کا تحقق کراہت تحریمی کے ساتھ ہوتا ہے مگر تحقق ہوجاتا ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ ان چیزوں سے استنجاء کرنے پر جو نہی وارد ہوئی ہے، وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ پاکی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ازالہ نجاست حاصل ہے بلکہ اس لئے کہ یہ چیزیں جنات اور ان کے جانوروں کی غذا ہیں، اس لئے استنجاء کا تحقق تو ہوجائے گا مگر کراہت آئے گی۔

البول فی المغتسل

غسل خانہ میں پیشاب کرنا

جمہور رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ..... اگر غسل خانے کا فرش کچا ہو تو اس میں پیشاب کرنا مکروہ ہے، اور اگر پختہ ہو تو کوئی کراہت نہیں ہے۔

دلیل...... چونکہ جب زمین کچی ہوگی، تو پانی فوراً جذب تو ہوتا نہیں اس لئے گندا پانی جمع ہو جائے گا، اور اس میں پیشاب کے قطرات مل جائیں گے جو کہ غسل کے دوران اُچھل کر بدن پر لگیں گے، جس سے وساوس پیدا ہوں گے، اور اگر زمین پختہ ہے تو پیشاب کر کے پانی بہانے سے پیشاب بہہ کر نکل جائے گا اور فرش پاک ہو جائے گا اب اس میں نہانے سے کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوگا۔

امام نووی رحمہ اللہ..... ان کا قول جمہور رحمھم اللہ کے بالکل برعکس ہے یعنی غسل خانے کا فرش اگر کچا ہو تو اس میں پیشاب کرنے میں کوئی کراہت نہیں اور اگر پختہ ہو تو مکروہ ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ اگر فرش کچا ہوگا تو پیشاب جذب ہو جائے گا، اور زمین میں نیچے اتر جائے گا اس صورت میں غسل کرنے سے کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوگا کیونکہ پیشاب اوپر رہا ہی نہیں، اور اگر فرش پختہ ہوگا تو پیشاب اوپر ہی رہے گا اور عند الغسل اس کی چھینٹیں بدن پر آ کر لگیں گی جن سے وساوس پیدا ہوں گے۔

جواب...... یہ کہنا کہ کچی زمین پر پیشاب فوراً جذب ہو جائے گا، ہمیں تسلیم نہیں اور اگر مان بھی لیں تو زمین کے اوپری حصہ میں پیشاب کے کچھ نہ کچھ اجزاء ضرور باقی رہیں گے، اور وہی اجزاء عند الغسل بدن پر لگ کر وساوس کا باعث بنیں گے، اور اگر فرش پختہ ہے، تو غسل سے قبل پانی ڈال کر پیشاب کو بہایا جا سکتا ہے اور اس صورت میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوگا، حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

کتاب الوضوء

حکم فاقد الطهورين

یعنی جس شخص کو پاک پانی اور پاک مٹی دونوں چیزیں میسر نہ ہوں، تو وہ کیا کرے گا، آیا بغیر طہارت ہی نماز ادا کرے گا یا قضا کرے گا؟ اس سلسلہ میں چاروں ائمہ کا الگ الگ

مسلک ہے۔ چنانچہ......

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......ایسا شخص نہ نماز پڑھے گا اور نہ ہی قضا کرے گا۔

دلیل...... یہ ہے کہ ایسا شخص نماز کا اہل ہی نہیں ہے اس لئے کہ نماز کی اہلیت طہارت کے ساتھ آتی ہے۔ اور طہارت ہے نہیں، سو اس سے ادا ساقط ہوجائے گی، اور چونکہ اس کی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے اس لئے قضا بھی ساقط ہوجائے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......ایسا شخص فی الحال تو بغیر طہارت ہی کے نماز پڑھے گا، پھر بعد میں جب طہارت حاصل ہوجائے گی تو اس کی قضا کرے گا۔

دلیل......حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اذا امرتکم بشیء فخذوا منه مااستطعتم'' (ابن ماجہ ص۲) یعنی جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس کو بجالاؤ، اور یہاں اس شخص میں بغیر طہارت ہی بجالانے کی استطاعت ہے، اس لئے فی الحال بغیر طہارت کے ہی نماز ادا کرے گا اور بعد میں اصول کے مطابق طہارت کے ساتھ اس کی قضا کرلے گا۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک......ایسا شخص بغیر طہارت ہی نماز پڑھے گا اور قضا نہیں کرے گا۔

دلیل...... یہ ہے کہ وہ اس وقت اتنے پر ہی قادر ہے اس سے زائد پر قادر نہیں ہے، اس لئے اسی حال میں اس کی نماز معتبر ہوجائے گی۔ اور جب نماز معتبر ہوگئی تو اب اس کی قضا کرنے کی ضرورت نہیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......ایسا شخص نماز ادا نہ کرے گا، بلکہ صرف قضا کرے گا۔

دلیل......حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''لا تقبل صلوٰۃ بغیر طهور'' (ترمذی ص۳ ج۱، مسلم ص۱۱۹ ج۱) کہ بغیر طہارت کے نماز ادا نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ شخص نماز ادا نہیں کرے گا، ہاں جب طہارت حاصل ہوجائے گی تو اس پر قضا واجب ہوگی۔ (ان مذاہب اربعہ کو مولانا اسعد اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے نظم فرمادیا ہے)

مالک رحمہ اللہ بھی، شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں احمد رحمہ اللہ بھی اور ہم
لا لا، نعم نعم، ونعم لا، ولا نعم

صاحبین رحمھما اللہ کہتے ہیں کہ......اگر چہ وہ اس وقت نماز کا اہل نہیں ہے، مگر تشبہ بالمصلین کے طور پر نماز جیسی ہیئت اختیار کرے گا اور اس میں قرأت وغیرہ کچھ نہ کرے گا، بعد میں حصول طہارت پر قضا کرے گا یہی قول از روئے فقہ زیادہ راجح ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کا بھی اسی قول کی طرف رجوع ثابت ہے اور عندالاحناف یہی قول مفتیٰ بہ ہے۔

دلیل......ایسے شخص کو دوسری عبادات پر قیاس کر کے تشبہ بالمصلین کا حکم دیا جائے گا، اور اس کی بہت سی نظریں ہیں، مثلاً بچہ نہار رمضان میں بالغ ہو جائے یا کافر اسلام لے آئے یا حائضہ پاک ہو جائے تو ان کو دن کے بقیہ حصے میں تشبہ بالصائم یعنی امساک کا حکم دیا جاتا ہے اور بعد میں اس روزے کی قضاء واجب ہے۔ (معارف السنن ص ۳۲ ج ۱) اسی طرح اگر حاجی کا حج کسی وجہ سے فاسد ہو گیا تو وہ فی الحال تشبہ بالحجاج کرتے ہوئے ارکانِ حج کو ادا کرے اور آئندہ سال اس حج کی قضاء واجب ہے۔ اسی طرح گونگا شخص قرأت نہیں کر سکتا تو نمازیوں کی مشابہت میں ہونٹ ہلاتا رہے۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔

السّواک

مسواک سنت صلوٰۃ ہے یا سنت وضوء، اس میں قدرے اختلاف ہے۔

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک......مسواک سنت صلوٰۃ ہے۔

دلیل......حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **لولا ان اشق علیٰ امتی لا مرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ.** (ابوداؤد ص ۷، ج ۱، ترمذی ص ۱۲ ج ۱) علاوہ ازیں دوسری اس قسم کی روایات بھی ان کا مستدل ہیں۔

جواب......حدیث مذکور میں جو عند کل صلوٰۃ وارد ہوا ہے۔ وہاں ایک لفظ محذوف ہے اور عبارت یوں ہے: **عند وضوء کل صلوٰۃ** اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اسی روایت میں مع الوضوء کے الفاظ موجود ہیں (بخاری کتاب الصوم باب السّواک الرّطب......مجمع الزوائد ص ۲۲۱ ج ۱ باب فی السواک) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسواک سنت وضوء ہے نہ کہ سنت صلوٰۃ۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک......مسواک صرف سنت وضوء ہے۔

دلیل......(۱) ان حضرات کا مستدل وہ احادیث ہیں جن میں عند کل وضوء اور

مع کل وضوء کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ (۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی نماز کیلئے کھڑے ہوتے وقت مسواک فرمائی ہو۔ (۳) مسواک باب طہارت سے ہے۔ اس کا بھی تقاضہ یہی ہے کہ مسواک کو سنت وضوء قرار دیا جائے، نہ کہ سنت صلوٰۃ۔ (۴) نماز کے وقت مسواک کرنے میں دانت سے خون نکلنے کا بھی اندیشہ ہے۔ جو کہ شافعیہ کے یہاں اگر چہ ناقض نہیں تاہم پسندیدہ بھی نہیں ہے۔

التسمیة عند الوضوء

وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا

اصحاب الظواہر کے نزدیک..... تسمیہ علی الوضوواجب ہے۔ یہی ایک روایت امام احمدؒ کی ہے۔

دلیل..... حدیث نبوی ﷺ ہے: **لا وضوء لمن لم یذکر اسم الله علیه**. (ترمذی: ۱/۱۳، ابوداؤد: ۱/۱۴) کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ کا نام نہ لے اس کا وضوء نہیں ہوتا، اس کے علاوہ بھی دوسری اس قسم کی احادیث سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔

جواب..... یہ ہے کہ حدیث مذکور میں لا نفئ کمال کیلئے ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا وضوء کامل نہیں ہوتا جو تسمیہ نہ پڑھے۔ نفی صحت کیلئے نہیں ہے اور اس کی بہت سی نظریں ہیں جیسے: **لا صام من صام الابد** (بخاری کتاب الصوم) **لا صلوٰة لجار المسجد الافی المسجد (الحدیث) لاایمان لمن لا امانة له(الحدیث)** وغیرہ۔

جمہور ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک..... تسمیہ علی الوضوء اصح قول کے مطابق سنت ہے جبکہ ایک روایت ائمہ اربعہ رحمھم اللہ سے استحباب کی بھی ہے۔

دلیل..... تسمیہ کا ثبوت اخبار آحاد سے ہوا ہے۔ اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی۔ (۲) وضوء کو نقل کرنے والے بائیس سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے تسمیہ کا ذکر نہیں کیا اگر تسمیہ واجب ہوتا تو وہ ضرور اس کو ذکر کرتے۔ (۳) بعض احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کے ساتھ الحمد للہ بھی کہنے کا حکم فرمایا ہے۔ (آثار السنن ص ۳۰ بحوالہ معجم طبرانی صغیر مجمع الزوائد ص ۲۲۰ ج ۱) حالانکہ الحمد للہ کو کوئی

بھی واجب نہیں کہتا، تو پھر بسم اللہ کا وجوب کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔

حكم المضمضة والاستنشاق

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... مضمضہ اور استنشاق وضوء اور غسل دونوں میں فرض ہیں۔

دلیل...... (۱) حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا توضّأت فمضمض (ابوداؤد ص ۱۹ ج ۱) کہ جب تو وضوء کرے تو مضمضہ کر۔ (۲) حضرت سلمہ بن قیس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے "اذا توضّأت فانتثر" (ترمذی ص ۱۴ ج ۱) کہ جب تو وضوء کرے تو ناک چھینک لیا کر۔ ان دونوں روایتوں میں امر کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جو کہ وجوب کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مضمضہ اور استنشاق دونوں واجب ہیں۔

جواب...... یہ ہے کہ مذکورہ احادیث میں جو امر کے صیغہ سے خطاب کیا گیا ہے وہ وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ استحباب کے لئے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے فرمایا تھا: اذا قمت الی الصلوٰة فتوضأ کما امرک الله (ترمذی ص ۶۶، ج ۱) کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اسی طرح وضوء کر اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں وضوء کا ذکر فرمایا ہے وہاں مضمضہ اور استنشاق کا کوئی ذکر نہیں ہے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں واجب نہیں ہیں۔

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... وضوء اور غسل دونوں میں سنت ہیں۔

دلیل...... (۱) ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور حدیث "عشر من الفطرة" (ابوداؤد ص ۸ ج ۱) سے ہے جس میں مضمضہ اور استنشاق کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ (۲) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان من الفطرة المضمضة والاستنشاق (ابوداؤد ص ۸ ج ۱)

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ...... مضمضہ اور استنشاق وضوء میں تو سنت اور غسل میں فرض ہیں۔

دلیل...... (۱) وضوء میں مضمضہ اور استنشاق کے سنت ہونے کی دلیل تو وہی احادیث ہیں جو شافعیہ و مالکیہ کی ہیں۔ رہی غسل میں ان دونوں کے فرض ہونے کی دلیل تو قرآن کریم میں ہے: وان كنتم جنباً فاطّهروا (الآیۃ) کہ اگر تم جنبی

ہو جاؤ تو خوب پاکی حاصل کرو یہاں غسل کے بیان میں مبالغہ کا صیغہ لایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ غسل جنابت میں وضوء سے زیادہ مبالغہ ہوگا اور مبالغہ کی جہاں اور بہت سی شکلیں ہیں وہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو چیزیں وضوء میں سنت ہیں ان کو غسل جنابت میں فرضیت کا درجہ دے دیا جائے۔ (۲) محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی روایت ہے: **امر رسول الله صلی الله علیه وسلم بالاستنشاق من الجنابة ثلاثاً** (دار قطنی ص ۱۱۵ ج ۱) اس حدیث سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ مضمضہ واستنشاق میں واجب (فرض) ہیں۔ (۳) غسل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مضمضہ واستنشاق بلاترک ثابت ہے جو کہ خود وجوب کی دلیل ہے۔

مقدار المسح علی الرّاس

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کتنی مقدار میں سر کا مسح فرض ہے؟

امام ابوحنیفہ وصاحبین رحمھم اللہ فرماتے ہیں کہ...... ربع رأس (چوتھائی سر) کا مسح فرض ہے اور استیعاب (پورے سر کا مسح) سنت ہے۔

دلیل...... قرآن پاک کی آیت کریمہ ہے "**وامسحوا برؤ وسکم**" (سورۃ المائدۃ پ ۶) مقدار مسح میں یہ آیت مجمل ہے اور حدیث پاک میں اس کی تفسیر ربع رأس سے کی گئی ہے۔ حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "**انّ النّبی صلی الله علیه وسلم توضّأ فمسح بناصیته**" (مسلم باب المسح علی الناصیۃ، وابوداؤد، ترمذی، نسائی)

امام مالک وامام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... استعیاب (پورے سر کا مسح) فرض ہے۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے: "**وامسحوا برء وسکم**" اس میں "با" زائدہ ہے۔ اس لئے استیعاب مراد ہے۔

جواب...... اگر استیعاب فرض ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناصیہ کے مسح پر اکتفانہ فرماتے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... (کم از کم) تین بالوں پر مسح کرنا فرض ہے۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے: "**وامسحوا بر ء وسکم**" اس میں لفظِ مسح مطلق ہے اور اس کو اپنے اطلاق اور عموم پر رکھنا چاہئے۔

جواب...... ناصیہ کے مقدار سے کم مسح اگر کافی ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم ایک

مرتبہ بیانِ جواز کے لئے اس پر عمل فرماتے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناصیہ کی مقدار سے کم مسح کہیں ثابت نہیں۔

مسح الرأس مرة او ثلاثا

وضوء میں سر پر مسح ایک مرتبہ کیا جائے گا یا تین مرتبہ۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... دوسرے اعضاء کی طرح مسح رأس بھی تین مرتبہ ہوگا۔

دلیل...... حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے وضو کیا اور اس میں تین مرتبہ سر کا مسح کیا پھر فرمایا: رأيت رسول الله ﷺ توضأ هكذا۔ (ابو داؤد، باب صفۃ وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح وضوء کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

جواب...... یہ حدیث شاذ ہے، کیونکہ اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باقی ساری روایات ایک ہی مرتبہ پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اگر ان کی اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔

ائمہ ثلاثہ رحمھم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ...... مسح رأس ایک مرتبہ کیا جائے گا۔

دلیل...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: فمسح برأسه مرة واحدة (ابوداؤد ص۱۵ ج۱) اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہو رہا ہے کہ مسح رأس ایک مرتبہ ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز قیاس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ شریعت نے دوسرے جن صورتوں میں مسح کی اجازت دی ہے وہاں بھی مرۃً واحدۃ ہی ہے جیسا کہ خفین اور جبیرہ پر۔

الاذنان من الرأس

کیا کانوں کے مسح کے لئے نیا پانی لیا جائے گا یا سر کے بعد ہاتھوں پر جو پانی بچا ہے وہی کافی ہوگا؟

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... مسح اذنین کے لئے ماء جدید لینا واجب ہے۔

دلیل...... حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسح کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں: واخذ ماء

جدیداً لصماخیہ فمسح صماخیہ (معارف السنن ص١٨٢ ج١) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کانوں کے لئے نیا پانی لیا۔ اور نئے پانی سے اپنے دونوں کانوں کا مسح فرمایا۔

جواب...... یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے کہ اس میں ایک راوی عمر بن ابان مجہول ہے۔ یا پھر یہ اس وقت پر محمول ہے جب کہ ہاتھوں کا پانی بالکل سوکھ گیا ہو اور سر کے مسح کے بعد ہاتھوں پر تری باقی نہ رہی ہو۔ اس وقت ہمارے نزدیک بھی نیا پانی لینا سنت ہے۔

امام اعظمؒ واحمدؒ فرماتے ہیں کہ...... مسح اذنین کیلئے ماء جدید لینا ضروری نہیں ہے بلکہ سر کے بچے ہوئے پانی سے ہی کانوں کا مسح کرنا سنت ہے یہی ایک روایت امام مالکؒ کی بھی ہے۔

دلیل...... (١) حدیث میں ہے: الاذنان من الرأس (ابوداؤد:١/١٨، ترمذی:١/١٦) کہ کان سر ہی کا ایک حصہ ہیں، آپ ﷺ کا مقصود اس سے بیان خلقت نہیں ہے بلکہ بیان حکم ہے کہ کان سر کے تابع ہیں، اس لئے مسح بھی سر کے ساتھ ایک ہی پانی سے کیا جائے گا، الگ سے پانی لینے کی ضرورت نہیں۔ (٢) آنحضور ﷺ کے وضو کو نقل کرنے والے متعدد صحابہ نے اس کو نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اور کانوں کا مسح ایک ساتھ فرمایا۔ یہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

الوضوء من الریح

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... ریح قبل (آگے سے ہوا کا نکلنا) مطلقاً ناقض وضوء ہے۔

دلیل...... ان کا ایک قاعدہ ہے: مایخرج من السبیلین فھو ناقض کہ جو شئی بھی سبیلین سے خارج ہو وہ ناقض وضوء ہے، اور ریح قبل بھی اسی میں سے ہے اس لئے وہ بھی ناقض ہوگی۔

امام اعظم وامام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... ریح قبل مطلقاً غیر ناقض ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ ریح قبل درحقیقت ریح ہی نہیں ہے بلکہ عضلات کا اختلاج ہے، اور اگر ریح مان بھی لیں تب بھی بقول صاحب ہدایہ وہ محل نجاست سے گزر کر نہیں آتی، اس لئے ناقض نہ ہوگی، البتہ اگر عورت مفضاۃ (جس عورت کے

پیشاب وپاخانہ کے راستے مل جائیں) ہوتو اس کے لئے وضو کر لینا مستحب ہے۔

الوضوء من النوم

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ.....نوم (یعنی نیند) مطلقاً ناقض وضوء ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر یہی قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ہے۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: سے منقول ہے کہ نوم مطلقاً غیر ناقض ہے یہی قول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا ہے۔

دلیل......"عن انس رضی اللہ عنہ قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینامون ثم یقومون فیصلون و لایتوضأون" (ترمذی:۱/۲۴) کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوجاتے تھے، پھر کھڑے ہوتے اور نماز پڑھتے تھے (دوبارہ) وضو نہیں کرتے تھے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نوم ناقض وضو نہیں ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہ واقعہ ان صحابہ کرامؓ کا ہے جو نماز کے انتظار میں بیٹھتے تھے اور ہلکی سی نیند آجاتی تھی (از درسِ ترمذی:۱/۲۹۶) اور ایسی نوم خفیف واقعتاً غیر ناقض ہے۔ اس کے ہم بھی قائل ہیں۔ گویا حدیث مذکور سے نوم خفیف کا غیر ناقض ہونا ثابت ہو رہا ہے نہ کہ نوم مطلق کا۔ اس لئے اس حدیث سے مطلقاً نوم کے غیر ناقض ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک.....نوم غالب ناقض اور نوم غیر غالب غیر ناقض ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ حدیث نبوی (ترمذی:۱/۲۴) میں نقض وضو کا مدار استرخاء مفاصل پر رکھا گیا ہے اور استرخاء مفاصل چونکہ نوم غالب میں ہو جاتا ہے اس لئے نوم غالب ناقض وضو ہے، لیکن نوم غیر غالب میں استرخاءِ مفاصل نہیں ہوتا، اس لئے وہ ناقض نہیں ہے۔

الوضوء مما غیّرت النّار

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آخری دور سے آج تک اس بات پر اجماع ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ صحابہ کرامؓ کے ابتدائی دور میں اس مسئلہ میں قدرے اختلاف تھا اور بعض صحابہ جیسے عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، ابوطلحہ، ابو ہریرہؓ، انس بن مالکؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ وام حبیبہؓ وضوء مما مست النار کے قائل تھے۔

دلیل...... یہ حضرات دلیل میں بعض قولی وفعلی روایات پیش کرتے تھے جن

میں سے بعض میں آپ ﷺ نے مامست النار سے وضو کا حکم فرمایا ہے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے: ''عن النبی ﷺ قال توضأوا مما غیّرت النار''۔ (طحاوی شریف ص ٥٠)

جواب...... جمہورؒ نے اس قسم کی روایات کے متعدد جوابات دیئے ہیں: (١) وضو مما مست النار کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ''کان آخر الامرین من رسول اللہ ﷺ ترک الوضوء مما غیّرت النار''۔ (ابوداؤد ١/٢٥) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلہ میں آخری عمل ترک وضو تھا۔ (٢) جن احادیث سے وضو کا ثبوت ملتا ہے ان میں وضو سے وضو شرعی مراد نہیں ہے بلکہ وضو لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے۔ اس کی دلیل حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ دعوت میں کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھوئے اور ہاتھوں کی تری سے اپنے چہرہ مبارک، ہاتھوں اور سر کو پونچھ لیا اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''یا عکراش ھٰذا الوضوء مما غیّرت النار'' (ترمذی شریف: ٢/٧، کتاب الاطعمہ) (٣) آپ ﷺ کا یہ حکم وجوب کیلئے نہیں تھا بلکہ استحباب کیلئے تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ سے وضو اور ترک وضو دونوں ثابت ہیں، اور یہ استحباب ہی کی علامت ہے۔

الوضوء من لحوم الابل

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اونٹ کے گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ کچا کھائے یا پکا کر۔

دلیل...... حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہتے ہیں کہ: ''سئل رسول اللہ ﷺ عن الوضوء من لحوم الابل فقال توضأوا منھا'' (ترمذی ص ٢٥ ج ١) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لحوم ابل سے وضو کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کے کھانے سے وضو کیا کرو۔ معلوم ہوا کہ لحوم ابل ناقض وضو ہے۔

جواب...... (١) آپ ﷺ نے جو اس حدیث میں وضو کا حکم فرمایا ہے، وہ وجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ استحباب کے لئے ہے، جس کی دلیل طبرانی کبیر کی وہ روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے لحوم ابل کے ساتھ البان ابل سے بھی وضو کا حکم دیا ہے۔ (مجمع الزوائد: ٢/٢٥٠) اور البان ابل

سے وضو امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی واجب نہیں تو لحوم ابل سے بھی واجب نہ ہوگا۔
(۲) یہاں بھی وضوء سے وضوء شرعی مراد نہیں ہے، بلکہ وضوء لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے۔
ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......وضوء من لحوم الابل واجب نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے۔

الوضوء من مسّ الذکر

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......مس ذکر (عضو تناسل کو ہاتھ لگانا) ناقض وضو ہے، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک بہر صورت اور امام مالک وامام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جب کہ باطن کف سے ہو۔ نیز مالکیہ کی کتاب بدایۃ المجتہد میں مفتیٰ بہ قول سنیت کا منقول ہے۔

دلیل......حضرت بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من مس ذکرہ فلا یصلّ حتیٰ یتوضأ" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اپنا ذکر چھولیا ہو وہ نماز نہ پڑھے یہاں تک کہ وضو کرلے۔ (ترمذی: ۱/۲۵)

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......مس ذکر ناقض وضو نہیں ہے۔

دلیل......حضرت طلق بن علیؓ کی روایت ہے: "عن النبی ﷺ قال ھل ھو الا مضغۃ منہ او بضعۃ منہ" (ترمذی: ۱/۲۵ وابوداؤد: ۱/۲۴) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ تو صرف جسم کا ایک لوتھڑا ہے یا (ارشاد فرمایا) جسم کا ایک حصہ ہے، نیز کتابوں میں یہی حدیث تفصیل کے ساتھ بھی موجود ہے۔ جس میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ ایسا شخص جو دوران نماز اپنے ذکر کو چھولے اس پر وضو ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا انما ھو بضعۃ منک" کہ نہیں اس لئے کہ وہ تمہارے جسم ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ (اعلاء السنن ص ۱۹۰ ج ۱) اس حدیث سے صراحتاً ترک وضو ثابت ہو رہا ہے۔

دفع تعارض......سند کے اعتبار سے دونوں فریق کی روایات قابل استدلال ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ قائم ہے۔ ایسی صورت میں تطبیق بین الروایتین کی صورت اختیار کی جاتی ہے، یا کسی ایک کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو چند وجوہ ترجیح دی گئی ہے۔ (۱) حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت واضح ہے اس

کے برخلاف حضرت بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مبہم ہے۔اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ وضو کا یہ حکم مس بالشہوت کی صورت میں ہے یا بلاشہوت کی، بحائل کی صورت میں ہے یا بلا حائل کی، وغیرہ۔(۲) حضرت طلق بن علیؓ کی روایت کی تائید اکثر اکابرین صحابہ کرامؓ کے اقوال وآثار سے ہوتی ہے، جبکہ ان کی تائید صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک اثر سے ہوتی ہے۔(۳) قیاس سے بھی حنفیہ کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ بول و براز جو کہ نجس العین ہیں ان کا مس کسی کے نزدیک بھی ناقض وضوء نہیں ہے تو ''اعضاء مخصوصہ'' جو کہ بالاتفاق طاہر ہیں ان کا مس بدرجہ اولیٰ ناقض نہیں ہوگا۔

الوضوء من مسّ المرأة

عورت کو چھونے سے وضو کا اعادہ

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... مس مرأۃ تین شرطوں کے ساتھ ناقض وضوء ہے، کبیرہ ہو، اجنبیہ ہو، مس بشہوۃ ہو۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... مس مرأۃ مطلقاً ناقض وضو ہے خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، محرمہ ہو یا اجنبیہ، بشہوۃ ہو یا بلاشہوۃ، بس شرط یہ ہے کہ بلا حائل ہو۔

دلیل...... اس مسئلہ میں کوئی حدیث ان کا مستدل نہیں ہے۔ البتہ آیت تیمّم کے ایک جز او لا مستم النساء میں جو دوسری قرأت لمستم ہے۔ اس کو اپنا مستدل قرار دیتے ہیں کہ یہاں لمس بالید مراد ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ''لمستم'' سے مراد جماع کرنا ہے نہ کہ لمس بالید چنانچہ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ''لمستم'' کو جماع کے معنی میں لیتے ہیں۔ اور اس کی تائید میں ایک اور آیت ''وان طلّقتموھن من قبل ان تمسوھن'' کو پیش کرتے ہیں کہ مس اور لمس دونوں کے معنی ایک ہیں پس جس طرح اس آیت میں مس سے جماع مراد ہے۔ اس آیت میں بھی لمس سے جماع مراد ہوسکتا ہے۔ نیز دوسری قرأت ''لامستم'' بھی ہماری مؤید ہے اس لئے کہ باب مفاعلۃ سے ہے، اور جو فعل مفاعلۃ سے آتا ہے۔ اس کا تحقق جانبین سے ہوتا ہے، اور یہ صورت جماع ہی میں ہوسکتی ہے۔ مس بالید میں نہیں ہوسکتی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... مس مرأۃ ناقض وضو نہیں ہے۔ الا یہ کہ مباشرت فاحشہ ہو۔

دلیل......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبّل بعض نساءہ ثم خرج الی الصلوٰۃ ولم یتوضأ '' (ترمذی:۱/ ۲۵) کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں سے ایک کا بوسہ لیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے نکل گئے اور وضو نہیں فرمایا۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مس مرأۃ ناقض وضو نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ: کے اس مسئلہ میں تینوں اقوال ہیں۔

الوضوء من القیء والرعاف

قے اور نکسیر پھوٹنے سے وضو

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......قے اور رعاف ناقض وضو نہیں ہے۔

دلیل......ان کا ایک اصولی مسئلہ ہے، کہ نجاست معتاد (یعنی وہ نجاست جو کہ عادۃً ہر انسان کے بدن سے نکلتی ہے جیسے بول وبراز) مخرج معتاد (یعنی سبیلین) سے نکلے تو ناقض ورنہ نہیں۔ چنانچہ قے اور رعاف نجاست معتاد بھی نہیں اور جہاں سے نکلتی ہیں وہ بھی نجاست کا مخرج معتاد نہیں ہے اس لئے ناقض نہ ہوں گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......بھی قے اور رعاف ناقض وضوء نہیں ہے۔

دلیل......ان کا اصول یہ ہے کہ صرف سبیلین سے نکلنے والی شئی ناقض ہے، اور قے اور رعاف سبیلین سے خارج نہیں ہوتیں، اس لئے ناقض بھی نہ ہوں گی۔ نیز حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی نماز پڑھ رہے تھے، دشمن نے حالت نماز ہی میں تین تیر ان کو مارے جس سے وہ لہولہان ہوگئے۔ لیکن نماز پڑھتے رہے۔ (ابو داؤد: ۱/ ۲۶، وبخاری: ۱/ ۱۲۹) معلوم ہوا کہ غیر سبیلین سے نکلنے والی نجاست ناقض نہیں ہوتی۔

جواب...... یہ صحابی (حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ) حالت استغراق میں تھے یا پھر ان کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا کہ جسم سے خون بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ورنہ وہ ضرور نماز ختم کردیتے۔ تیسرے یہ کہ صحابی کا یہ جزئی واقعہ احادیث صریحہ کا مقابل نہیں بن سکتا۔

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک......وہ قے جو غیر بلغم کی ہو اور منہ بھر کر ہو ناقض

وضو ہے اسی طرح بدن سے دم سائل کا خروج بھی ناقض وضو ہے خواہ وہ ناک سے ہو جسے رعاف کہتے ہیں یا بدن کے کسی اور حصہ سے ہو۔

فضل طهور المرأة

عورت کے وضوء یا غسل کے بعد برتن میں جو پانی بچ گیا ہے اس کا مرد کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک......عورت کے بچے ہوئے پانی کا مرد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

دلیل......حضرت حکم بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: "ان النبی ﷺ نهى ان يتوضأ الرجل بفضل طهور المرأة" (ترمذی شریف ج۱) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کا عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضوء کرنے سے منع فرمایا ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث مذکور میں نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے، اور کراہت تنزیہی بھی جواز ہی کا ایک شعبہ ہے، اس لئے مطلقاً **فضل طهور المراة** کے استعمال کو ناجائز کہنا درست نہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......عورت کے بچے ہوئے پانی کا مرد کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث ہے جس میں حضرت میمونہؓ کے یہ الفاظ منقول ہیں "كنت اغتسل انا ورسول الله ﷺ من اناءٍ واحد من الجنابة" کہ میں اور آپ ﷺ ایک ہی برتن سے جنابت کا غسل کرتے تھے۔ (ترمذی:۱/۱۹) اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے استعمال کے بچے ہوئے پانی کا مرد کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

الوضوء بالنبيذ

احکام کے اعتبار سے نبیذ کی تین قسمیں ہیں:

(۱) تھوڑی دیر کھجوریں پانی میں ڈال کر نکال لی جائیں کہ ابھی تک پانی میں مٹھاس

کا اثر بھی نہ آیا ہو۔اس نبیذ سے وضو کرنا بالاتفاق جائز ہے،اس لئے کہ حقیقتاً یہ نبیذ ہی نہیں ہے۔(۲) کھجوروں کو اتنی دیر پانی میں بھگویا جائے کہ پانی میں تغیر آجائے، حدّت وتیزی اور جھاگ ونشہ پیدا ہو جائے۔اس نبیذ سے بالاتفاق وضو نا جائز ہے۔(۳) کھجوروں کو اتنی دیر پانی میں رکھا جائے کہ صرف مٹھاس پیدا ہو جائے، جھاگ نشہ اور اسی طرح حدّت وتیزی اس میں نہ آئے۔اس قسم کے نبیذ سے وضو میں اختلاف ہے چنانچہ......

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......اس نبیذ سے وضوء کرنا جائز ہے، ایسی نبیذ کی موجودگی میں تیمّم کرنے کی اجازت نہیں ہے، جبکہ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی نبیذ سے وضوء بھی کرے اور تیمّم بھی کرے۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی لیلۃ الجن والی حدیث ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے نبیذ تمر سے وضو فرمایا، اور ارشاد فرمایا: ''تمرة طیبة وماء طھور'' (ترمذی:۱/۲۶، وابوداؤد:۱/۱۲) کہ کھجور بھی پاکیزہ ہے اور پانی بھی پاک ہے۔اسی حدیث کی بنا پر امام اعظمؒ نبیذ تمر سے وضو کے جواز کے قائل تھے۔

جواب......ائمہ ثلاثہ اس حدیث کی تضعیف کے درپے ہیں، اور اس حدیث پر بہت سے اعتراض کرتے ہیں، جن کے بعض احناف نے جواب بھی دیئے ہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......ایسی نبیذ سے وضو کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اس نبیذ کے علاوہ دوسرا پانی نہ ہو تو تیمّم کرے، نبیذ سے وضو نہ کرے، یہی قول امام ابو یوسف کا بھی ہے۔

فائدہ......(۱): یہ اختلاف صرف نبیذ تمر میں ہے، تمر کے علاوہ دوسری اشیاء سے بنائی ہوئی نبیذ سے بالاتفاق وضو جائز نہیں ہے۔

فائدہ......(۲): حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کا وہ پہلا قول ہے جو اوپر مذکور ہوا لیکن بعد میں ان کا جمہور کی طرف رجوع ثابت ہے۔(البدائع ص ۱۵ ج ا و معارف السنن ص ۳۱۰ ج ۱)

حکم الاکسال

جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اجماع ہے کہ اکسال (جماع بلا انزال) سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

دلیل......حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں: ''اذا جاوز

الختان الختان وجب الغسل فعلته انا ورسول الله ﷺ فاغتلسنا" (ترمذی ج:١) کہ جب ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ سے تجاوز کرجائے (داخل ہوجائے) تو غسل واجب ہوجاتا ہے۔ میں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کیا، پھر ہم دونوں نے غسل کیا۔

داؤد ظاہری رحمہ اللہ کے نزدیک.....جب تک انزال نہ ہوجائے، فقط اکسال (دخول) سے غسل واجب نہیں ہوتا۔

دلیل.....حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انّما الماء من الماء" (مسلم، ابوداؤد باب فی الاکسال، ج:١) کہ پانی (غسل) پانی (منی نکلنے) سے واجب ہوتا ہے۔

جواب.....(١) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس روایت کو حالتِ احتلام پر محمول کرتے ہیں: "عن ابن عباس ؓ قال انّما الماء من الماء في الاحتلام" (ترمذی، ج:١) یعنی خواب میں صرف دخول سے غسل واجب نہیں ہوتا جب تک انزال نہ ہو۔ (٢) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "الماء من الماء" ابتداءِ اسلام میں بطور رخصت تھا، بعد میں اس سے منع کیا گیا۔ (ترمذی، ج:١، باب ان الماء من الماء) (٣) شریعت میں بعض دفعہ سبب کو قائم مقام مسبّب کے رکھا جاتا ہے جیسا کہ خلوت صحیحہ کو جماع کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اس طرح چونکہ دخول سبب ہے انزال کا، اس لئے یہاں پر دخول کو انزال کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔

حکم المذی

مذی تمام ائمہ کے نزدیک نجس ہے، البتہ طریقہ تطہیر میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ چنانچہ:

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ.....ایسے کپڑے پر چھینٹیں ماردینا کافی ہے۔

دلیل.....حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "يكفيك ان تاخذ كفًّا من ماء فتنضح به ثوبك" (ترمذی:١/٣١) کہ تیرے لئے یہ کافی ہے کہ ایک چلو پانی لیکر اپنے کپڑے پر چھینٹیں مارلیا کرے، امام احمدؒ اسی حدیث کی وجہ سے چھینٹیں مارنے کے قائل ہیں۔

جواب...... یہاں نضح سے مطلقاً غسل یا غسل خفیف مراد ہے چھینٹیں مارنا مراد نہیں ہے۔
ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......مذی سے پاکی حاصل کرنے کیلئے غسل ضروری ہے، بغیر غسل کے پاکی حاصل نہ ہوگی۔

دلیل...... بخاری شریف کی روایت ہے جس میں واغسل ذکرک کے الفاظ موجود ہیں کہ اگر عضو پر مذی لگ گئی ہو تو اس کو دھولو۔ اس لئے مذی کے لگنے سے جب اس کے دھونے کا حکم فرمایا ہے تو اگر کپڑے پر لگ جائے گی، تب بھی دھونے کا ہی حکم ہوگا (نضح کافی نہ ہوگا)۔

ودی...... یہ بالاتفاق نجس ہے اس کے کپڑے پر لگنے سے دھونا ضروری ہے۔

حکم المنی

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......منی پاک ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے: ''انما کان یکفیه ان یفرکه باصابعه وربما فرکته من ثوب رسول الله ﷺ باصابعی'' (ترمذی: ۱/۳۱) کہ منی کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کو اپنی انگلیوں سے کھرچ دے، اور بسا اوقات میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو اپنی انگلیوں سے کھرچا ہے۔ حدیث مذکور میں منی کیلئے فرک (یعنی کھرچنے) کو کافی بتلایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منی پاک ہے، اس لئے کہ اگر منی پاک نہ ہوتی، تو صرف فرک پر اکتفاء نہ کیا جاتا، بلکہ غسل کا بھی حکم دیا جاتا، اس کے علاوہ ان تمام احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جن میں فرک کا ذکر ہے۔

جواب...... اشیاء نجسہ کی تطہیر کے طریقے مختلف ہوتے ہیں بعض جگہ تطہیر کے لئے غسل ضروری ہوتا ہے، بعض جگہ نہیں، چنانچہ روئی کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے دھن دیا جائے، اسی طرح زمین، یبس (سوکھنے) سے پاک ہوجاتی ہے، بالکل اسی طرح منی سے طہارت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ فرک کردیا جائے۔ (درس ترمذی ص ۳۴۹ ج ۱)
امام ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......منی ناپاک ہے، لیکن امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بہر صورت غسل ضروری ہے، جبکہ حنفیہ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر منی

رطب ہو تو غسل ضروری ہے اور اگر یابس ہو تو فرک کافی ہے۔

دلیل...... حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے دریافت کیا، کیا میں ان کپڑوں میں نماز پڑھ سکتا ہوں جن میں بیوی سے ملاقات کرتا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **نعم، الا ان تری فیه شیئا فتغسله**، کہ ہاں پڑھ سکتے ہو لیکن اگر تم اس میں کچھ لگا دیکھو تو اس کو دھو لینا۔ (موارد الظمآن ص۸۲ ج۱) نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے: **ان رسول الله ﷺ كان يغسل المنى ثم يخرج الى الصلوة فى ذلك الثوب وانا انظر الى اثر الغسل فيه**۔ (مسلم شریف: ۱/۱۴۰) ان تمام روایات میں لفظ غسل وارد ہوا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ منی نجس ہے، ورنہ غسل کا حکم نہ دیا جاتا۔

احكام المستحاضة

حنفیہ کے نزدیک...... مستحاضہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) مبتدءَ۔ (۲) معتادہ۔ (۳) متحیرہ، اس کو ضالّہ مضلّہ، اور سیہ بھی کہتے ہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... مستحاضہ کی چار قسمیں ہیں: (۱) مبتدءَ (۲) معتادہ (۳) متحیرہ۔ (۴) ممیّزہ۔

مبتدءَ...... وہ بالغ لڑکی جس کو زندگی میں پہلی مرتبہ حیض آیا، اور پھر مستقبل جاری ہو گیا۔

حکم...... اس کا حکم بالاتفاق یہ ہے کہ وہ حیض کی مدت گزارنے تک خون کو حیض شمار کرے گی اور اس عرصہ میں نماز روزہ چھوڑ دے گی۔ اور پوری مدت (دس دن) گزرنے کے بعد غسل کر کے نماز شروع کر دے گی اور بیس دن بعد پھر ایام حیض شمار کرے گی۔

معتادہ...... وہ عورت جس کو کچھ عرصہ تک ہر مہینہ کے چند مخصوص دنوں میں حیض آنے کی عادت بن گئی تھی پھر بعد میں خون آنے کے ایام بڑھ گئے۔

حکم...... ایام عادت کے بعد جو خون آ رہا ہے اگر وہ دس دن پورے ہونے تک بند ہو جائے، تو حیض کا شمار ہوگا، اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت تبدیل ہو گئی اور اگر دس دن کے بعد بھی خون جاری رہے تو ایام عادت کے بعد کے خون کو استحاضہ کا خون قرار دیا جائے گا اور ایام عادت کے بعد جتنی نمازیں اس نے چھوڑی ہیں، ان سب کی قضاء لازم ہوگی۔

متحیرہ......وہ عورت جو پہلے معتادہ تھی پھر مستقل خون آنے لگا اور ساتھ ہی اپنی عادت بھی بھول گئی۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

متحیرہ بالعدد......(۱) یعنی وہ عورت جسے ایام حیض کی تعداد یاد نہ رہی کہ پانچ دن حیض آتا تھا یا سات دن یا اور کچھ۔

حکم......اس کا یہ ہے کہ جس دن سے حیض آنا شروع ہو، اس دن سے وہ تین دن تین رات تک نماز چھوڑ دے گی، کیونکہ تین دن تو حیض کے یقینی ہیں، تین دن کے بعد اکثر مدت حیض کے جو سات دن باقی ہیں ان میں نماز غسل کرکے پڑھے گی۔ اس لئے کہ ہر نماز کے وقت یہ امکان ہے کہ حیض سے پاک ہوگئی ہو اور دس دن کے بعد اگلے حیض تک ہر نماز نیا وضو کرکے پڑھے گی۔

متحیرہ بالوقت......وہ عورت جسے وقت حیض یاد نہ رہا کہ شروع مہینہ میں آتا تھا یا درمیان میں یا آخر میں۔

حکم......ایسی عورت کا حکم یہ ہے کہ وہ خون جاری ہونے کے اول یوم سے ایام عادت کے ختم ہونے تک ہر نماز کے لئے نیا وضو کرے گی اور مہینہ کے بقیہ ایام میں ہر نماز کے لئے غسل کرے گی۔

متحیرہ بہما......وہ متحیرہ جو دونوں چیزیں بھول گئی ہو عدد بھی اور وقت بھی۔

حکم......اس کا یہ ہے کہ ہر مہینے کے شروع کے تین دن وضوء لکل صلوٰۃ کرے گی اور باقی ستائیس دن غسل لکل صلوٰۃ کرے گی۔

مدّة الحيض

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......حیض کی اقل مدت تین دن تین رات اور اکثر مدت دس دن ہے۔

دلیل......اس مسئلہ میں احناف کی مستدل چند روایات ہیں جو کہ اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن تعدد طرق کی بنا پر حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں، جس میں سے ایک روایت یہ ہے: **عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال الحيض ثلثة ايام واربعة وخمسة وستة وسبعة وثمانية وتسعة وعشرة فاذا جاوزت العشر فهي مستحاضة** ۔ (نصب الرایہ:۱/۱۹۶) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایام

حیض (کم از کم) تین دن ہیں (زیادہ سے زیادہ) چار دن، پانچ دن، چھ دن، سات دن، آٹھ دن، نو دن، دس دن، پھر اگر دس دن سے تجاوز کر جائے تو وہ مستحاضہ ہے۔

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......حیض کی اقل مدت ایک دن ایک رات ہے اور اکثر مدت پندرہ یوم ہیں۔

دلیل......ان حضرات کی اس مسئلہ میں کچھ صحیح الحال حدیث یہ ہے کہ: **تمکث احداکن شطر عمرها لا تصلي**، کہ تم میں سے ہر ایک اپنی عمر کا آدھا حصہ ٹھہری رہتی ہو نماز نہیں پڑھ سکتی۔ (تلخیص ص۱۶۳ ج۱) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت آدھی عمر نماز کے قابل نہیں رہتی اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب کہ ہر مہینہ کے پندرہ دن حیض کے مانیں۔ معلوم ہوا کہ حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہیں۔

جواب......علامہ ابن الجوزیؒ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے: ''**حديث لا يعرف**'' امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: **لم نجده**، اور خود امام نووی شافعیؒ فرماتے ہیں: **حديث باطل لا يعرف** یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ کی اس مسئلہ میں ترجمانی فرماتے ہوئے وہ اس حدیث کے بجائے قیاس سے استدلال کرتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......حیض کی اقل مدت کچھ متعین نہیں ہے، صرف ایک مرتبہ آ کر بھی ختم ہوسکتا ہے۔ البتہ اکثر مدت سترہ دن ہے۔

مدتِ نفاس......نفاس کی اقل مدت متعین نہیں ہے۔ البتہ اکثر مدت شوافع و مالکیہ نے تجربات کی بنا پر ساٹھ یوم اور حنفیہ وحنابلہ نے حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روشنی میں چالیس یوم مقرر کی ہے۔

الوان الحیض

حیض کی رنگتوں کا بیان

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......حیض کا خون صرف دو رنگ کا ہوتا ہے، کالا اور سرخ، ایام حیض میں جب تک اس رنگ کا خون آئے تو سمجھے کہ حیض کا خون ہے اور اگر خون کا رنگ تبدیل ہو جائے تو وہ حیض نہ ہوگا، یا ایام کے ذریعہ معلوم کرلے۔

دلیل......حدیث نبوی ہے: **فانه دم اسود يعرف فاذا كان ذلك**

فامسكي عن الصلوٰة (ابوداؤد شریف ص ۴۳ ج ۱) یعنی حیض کا خون ایک خاص قسم سیاہ رنگ ہوتا ہے جو کہ پہچان لیا جاتا ہے، پس اگر ایسا ہو تو نماز سے توقف کر۔ دیکھو اس حدیث میں حیض کا مدار رنگ پر بتلایا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رنگ کے ذریعہ بھی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہ کوئی پکی صورت نہیں ہے کہ ہر عورت کو کالا ہی خون آئے، بلکہ اختلاف امزجہ وبلاد کی وجہ سے الوان حیض مختلف ہو سکتے ہیں، اس لیے الوان پر حیض کی ابتداء وانتہاء کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ الوان کی تبدیلی سے تائید ہو سکتی ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... حیض کے شروع ہونے اور ختم ہونے کا مدار ایام پر ہے، رنگوں کا اعتبار نہیں ہے، ہر رنگ کا حیض آ سکتا ہے، اور وہ چھ ہیں سواد، حمرۃ، صفرۃ، کدرۃ، خضرۃ، اور تربتی۔

دلیل...... وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ عورت اپنے کپڑے بھیج کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے معلوم کرواتی تھیں کہ حیض ختم ہو گیا یا نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دیکھ کر فرماتی تھیں کہ جلدی نہ کرو حتیٰ ترين القصة البيضاء، یہاں تک کہ خالص سفیدی نہ دیکھ لو (جو کہ حیض کے اختتام کی علامت ہے) ۔اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رنگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ سارے رنگ حیض کے ہو سکتے ہیں، اس لئے جب تک سفید رطوبت نہ آ جائے، تب تک حیض شمار ہوگا اس سے پہلے خواہ کسی بھی رنگ کا خون آئے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... حیض کے خون چار ہیں، کالا، سرخ، زرد اور مٹیالا۔

الحائضة لاتقضى الصلوٰة

(۱) اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ روزہ کی قضا کرے گی لیکن نماز کی قضا نہیں کرے گی۔ ایام حیض کی نمازیں اس سے معاف ہیں۔ لیکن روافض کے نزدیک روزہ کی طرح نماز کی بھی قضا حائضہ پر واجب ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ سنت سے ثابت ہے، اور روافض سنت کو حجت نہیں مانتے۔ (۲) حائضہ سے نماز ساقط ہونے کی علت میں مختلف اقوال ہیں۔

امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... یہ حکم خلافِ قیاس ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... چونکہ اتنی نمازوں کی قضا کرنے میں اس کو مشقت ہوگی، اس لئے شارع نے ان کی قضا کو ساقط کردیا۔

صاحب بدائع......فرماتے ہیں کہ عورت پر وجوب نماز اور ادائیگی نماز دونوں کے لئے حیض سے پاک ہونا شرط ہے۔ اور حالت حیض میں وہ پاک نہیں ہوتی، اس لئے اس پر نماز کا وجوب نہیں آتا اور جب نماز واجب ہی نہیں ہوئی تو قضا کیسی؟ اور روزے کے واجب ہونے کے لئے طہارت شرط نہیں ہے ہاں ادا کیلئے شرط ہے، اس لئے بغیر طہارت، حالت حیض میں بھی روزہ اس پر واجب ہو جائے گا مگر چونکہ ادا کرنے کے لئے طہارت شرط ہے، اس لئے حالت حیض میں ادا فوت ہو جائے گی لیکن بعد میں اس کی قضا کرلے گی۔

قراءۃ القرآن للجنب والحائض

تمام ائمہ رحمھم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حیض ونفاس والی عورت اور جنبی آدمی درود، تسبیح، تحمید، تکبیر اور تہلیل کر سکتے ہیں (سبحان اللہ، الحمد اللہ، اللہ اکبر اور لا الا اللہ پڑھ سکتے ہیں) لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ قرآن پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ، امام شافعی واحمد رحمہم اللہ کے نزدیک......جنبی اور حائضہ ونفساء کے لئے قرآن کا پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔

دلیل......حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القرآن۔ (ترمذی باب ماجاء فی الجنب اھ ج:۱) کہ حائضہ اور جنبی قرآن میں سے کچھ نہ پڑھیں۔ (۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث ہے: ''قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُقرئنا القرآن علیٰ کلّ حال مالم یکن جنبا'' (ترمذی، ابن ماجہ) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہر حالت میں قرآن پڑھایا کرتے تھے سوائے حالت جنابت کے۔

داؤد ظاہری رحمہ اللہ کے نزدیک......حائضہ، نفساء اور جنبی کے لئے قرآن کا پڑھنا جائز ہے۔ (امام بخاری، طبری اور ابن منذر رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔) (طحاوی ج:۱، تحفۃ الاحوذی ج:۱)

دلیل......حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: ''قالت کان رسول اللہ ﷺ یذکر اللہ علی کل احیانہ'' (مسلم باب ذکر اللہ تعالیٰ ج:۱) کہ رسول

اللہ ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے، قرآن بھی ذکر ہے اور کلّ احیان میں وقت جنابت بھی داخل ہے۔

جواب……(۱) حدیث مذکور میں ذکر سے مراد ذکر قلبی ہے ورنہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث مذکور سے تعارض لازم آئے گا۔(۲) حضرت عائشہ صدیقہؓ والی روایت فعلی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت قولی ہے اور تعارض کے وقت ترجیح قولی روایت کو ہوتی ہے۔

الاستمتاع بالحائض

اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) استمتاع بالجماع: یہ باتفاق امت حرام ہے۔(۲) استمتاع بما فوق الازار: یہ بالاتفاق جائز ہے۔(۳) استمتاع بما تحت الازار: اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام احمد و محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ……تحت الازار سے استمتاع جائز ہے۔

دلیل……حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: **اصنعو کل شئی الا النکاح** (مسلم شریف ص۱۴۳ ج۱، ابوداؤد شریف ص۳۴ ج۱) کہ جماع کے علاوہ سب کچھ کر سکتے ہو، معلوم ہوا کہ موضع جماع کے علاوہ ہر جگہ سے استمتاع جائز ہے۔

جواب…… یہ ہے کہ حدیث مذکور میں جو موضع جماع سے استمتاع کی ممانعت کی گئی ہے اس میں آس پاس کا حصہ بھی داخل ہے اور یہ ممانعت اس کو بھی شامل ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ……ماتحت الازار کسی چیز سے بھی استمتاع جائز نہیں ہے۔

دلیل……حدیث نبوی ﷺ ہے، جو کہ اگرچہ صراحتاً دلالت نہیں کرتی لیکن مفہوماً دلالت کرتی ہے، چنانچہ جب ایک سائل نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ حالت حیض میں میرے لئے اپنی بیوی سے کون سی چیز جائز ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لک مافوق الازار**، کہ ازار سے اوپر سب کچھ جائز ہے۔ (ابوداؤد: ۱/ ۲۸) اس حدیث میں لفظ فوق نے آکر تحت کو خارج کر دیا، اور اب مفہوم یہ ہوگا کہ تحت الازار جائز نہیں ہے۔ اور یہی ہمارا مذہب ہے۔

دخول الحائض والجنب المسجد

امام اعظم وامام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... حائضہ اور جنبی کا مسجد میں داخل ہونا یا عبور کرنا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے: لا احل المسجد لحائض ولا جنب (ابوداؤد:۱/۳۰) اس حدیث سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے کہ حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں دخول ممنوع ہے۔ نیز ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں ہے: یا علی لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذ المسجد غیری وغیرک (ترمذی ج۲، باب مناقب علیؓ بن ابی طالب) کہ اے علی میرے اور تیرے سوا کسی کو بھی حالت جنابت میں اس مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں داخل ہونا (ٹھہرنا) جائز نہیں ہے۔ لیکن عبور کرنا جائز ہے۔

دلیل...... "یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکریٰ حتیٰ تعلموا ماتقولون و لاجنباً الا عابری سبیل حتی تغتسلوا" (النساء پ۵) اس آیت میں امام شافعیؒ صلوٰۃ سے موضع صلوٰۃ اور عابری سبیل سے مسجد کو عبور کرنے والا مراد لیتے ہیں تو اب آیت کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہوگا کہ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد میں نشہ کی حالت اور جنابت کی حالت میں جانا جائز نہیں ہے الا عابری سبیل مگر عبور کرنے والے کیلئے اجازت ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ آیت کریمہ میں صلوٰۃ سے ظاہری معنی نماز مراد ہے۔ موضع صلوٰۃ (مسجد) مراد نہیں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ نشہ کی حالت میں بغیر نشہ ختم ہوئے اور جنابت کی حالت میں بغیر غسل کئے ہوئے نماز کے قریب مت جاؤ اور الا عابری سبیل سے مسافر کا استثناء فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسافر جنبی ہو اور پانی موجود نہیں ہے تو وہ بدون غسل تیمّم کر کے ہی نماز ادا کر سکتا ہے اور صرف مسافر کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر حالت سفر ہی میں عدم وجدان الماء (پانی نہ ملنے) کی صورت پیش آتی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... حائضہ کے لئے کسی بھی صورت میں مسجد میں داخل

ہونا جائز نہیں ہے البتہ جنبی اگر رفع حدث کی نیت سے وضو کرے تو اس کے لئے مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

الغسل بعد الاسلام

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک......اسلام قبول کرنے کے بعد غسل کرنا مطلقاً واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......اگر حالت جنابت میں اسلام قبول کیا ہے، تو غسل کرنا واجب ہے، ورنہ مستحب ہے۔

فائدہ......حنفیہ کے نزدیک جنابت کا غسل اگر اسلام لانے سے پہلے بھی کرلیا تو اسلام لانے کے بعد وہ غسل معتبر ہو جائے گا، جمہور ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک معتبر نہیں ہوگا، کیونکہ غسل جنابت میں ان کے یہاں نیت ضروری ہے، اور کافر کی نیت معتبر نہیں، اس لئے ان کے نزدیک اسلام لانے کے بعد اس کو دوبارہ غسل جنابت کرنا ہوگا۔

مدّة المسح على الخفين

مسح علی الخفین کا مسئلہ تواتر سے ثابت ہے اور سوائے روافض وخوارج کے کوئی اس کا منکر نہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ مسافر ومقیم خفین پر کتنے دن تک مسح کرسکتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......مسح علی الخفین کیلئے کوئی مدت متعین نہیں بلکہ آدمی جتنے دن چاہے مسح کرے۔

> **دلیل**......حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مسافر کیلئے تین دن تین رات مقیم کیلئے ایک دن ایک رات مسح علی الخفین کی اجازت مرحمت فرمائی، آگے روایت میں ہے: "ولو استزدناه لزادنا" (ابوداؤد:۱/۲۱) کہ اگر ہم اور زیادتی کی درخواست کرتے تو آپ ﷺ ہمارے لئے اور زیادتی فرمادیتے۔ معلوم ہوا کہ مسح کی یہ مدت حتمی نہیں ہے، بلکہ اس میں زیادتی کا امکان ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ جس میں ہے کہ ایک صحابی آپ ﷺ سے مدت مسح دریافت کرتے ہوئے سات دن تک پہنچ گئے اس پر بھی آپ ﷺ نے نعم فرمایا اور اس کے ساتھ مزید کی بھی اجازت مرحمت فرمائی، چنانچہ فرمایا: مابدالک کہ تو (اتنے دن مسح کرسکتا ہے) جتنے دن چاہے۔ (ابوداؤد:۱/۲۱)

جواب......پہلی روایت کا جواب یہ ہے کہ اس میں ولو استزد ناه لزادنا کی جوزیادتی آئی ہے کہ اگر ہم مدت مسح بڑھوانا چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑھا دیتے یہ زیادتی صحیح نہیں ہے، اور دوسری روایت کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، اس لئے قابل استدلال نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک......مدت مسح متعین ہے، جو کہ مسافر کیلئے تین دن تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن ایک رات ہے دلیل حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کی روایت ہے: ''عن النبی ﷺ انه سئل عن المسح علی الخفین فقال للمسافر ثلاث وللمقیم یوم'' (ترمذی:۱/۲۷)

یہ حدیث صحیح اور جمہور کے مذہب پر صریح ہے اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث بھی ان حضرات کا مستدل ہیں۔

المسح علی ظاهر الخفین

محل مسح موزوں کا ظاہر (اوپر کی جانب) ہے یا باطن (نیچے کی جانب)؟

امام ابوحنیفہ واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک......محل مسح صرف ظاہر خفین ہے۔

دلیل......(۱) حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ سے روایت ہے: ''قال رأیت النبی ﷺ یمسح علی الخفّین علی ظاهر هما''۔ (ترمذی باب فی المسح علی الخفین ظاہرھما، وابوداؤد) کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''قال لو کان الدین بالرأی لکان اسفل الخفّ خفّیه''۔ (ابو داؤد باب کیف المسح) کہ اگر دین کا مدار قیاس پر ہوتا، تو موزوں کے نیچے کے حصے کی جانب مسح کرنا اوپر کے حصہ میں مسح کرنے سے بہتر ہوتا، حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے ظاہر پر مسح کرتے دیکھا ہے۔

امام مالک وشافعی رحمہما اللہ کے نزدیک......محل مسح ظاہر اور باطن (اعلیٰ واسفل) دونوں ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......اعلیٰ واسفل دونوں پر فرض ہے

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......اعلیٰ پر فرض، اسفل پر سنت ہے۔

دلیل......حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''انّ النبی صلی اللہ علیه وسلم مسح اعلیٰ الخفّ واسفله'' (ترمذی باب

فی المسح علی الخفین اعلاہ واسفلہ، ابوداؤد) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کے اوپر اور نیچے مسح کیا۔

جواب...... (۱) اس حدیث کو بڑے بڑے محدثین (امام بخاری، ترمذی، ابوداؤد، ابوزرعہ اور امام شافعی رحمہم اللہ) نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ یہ حدیث تمام صحیح روایات کے خلاف ہے۔ (تہذیب سنن ابی داؤد ج:۱، از حافظ ابن قیم رحمہ اللہ) (۲) محدّث بزّار رحمہ اللہ نے اِس روایت کو ساٹھ سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس سند کے علاوہ کسی سند میں ''اسفل'' کا لفظ نہیں ہے۔ (تلخیص الحبیر، العرف الشذی) (۳) امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی سنن (جلد ا باب المسح علی الخفین اعلاہ واسفلہ) میں لکھتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے بارے میں ابوزرعہ رحمہ اللہ اور محمد بن اسماعیل رحمہ اللہ (امام بخاری) سے پوچھا تو دونوں نے فرمایا کہ: ''یہ صحیح نہیں ہے''۔

المسح علی الجوربین

جوربین وہ موزے کہلاتے ہیں جو اون یا سوت وغیرہ کے ہوں ان کی دو قسمیں ہیں: ثخین اور رقیق...... ثخین وہ موزے ہیں جن میں تین شرطیں پائی جائیں۔ (۱) ان میں بآسانی پانی سرایت نہ کرسکے۔ (۲) وہ بغیر کچھ باندھے ہوئے پنڈلیوں پر رُکے رہیں۔ (۳) ان کو پہن کر دو تین میل چلا جاسکے۔۔۔۔۔ رقیق وہ موزے کہلاتے ہیں جن میں مذکورہ تینوں شرائط نہ پائی جائیں۔ پھر ان دونوں کی تین تین قسمیں ہیں۔

(۱) مُجلّد: یعنی وہ موزے جن میں اوپر اور نیچے کی طرف چمڑا لگا ہوا ہو۔

(۲) منَعّل: وہ موزے جن میں صرف نیچے کی طرف چمڑا لگا ہوا ہو۔

(۳) سادہ۔ وہ موزے جن میں کہیں چمڑا لگا ہوا نہ ہو۔

احکام...... ثخین کی تینوں قسموں (مجلد، منعل، اور سادہ) (حضرت امام اعظمؒ پہلے عدم جواز کے قائل تھے لیکن وفات سے تین یا نو دن قبل رجوع فرمالیا تھا) پر بالاتفاق مسح جائز ہے، اور رقیق کی ایک قسم مجلد پر بالاتفاق مسح جائز ہے، اور ایک قسم سادہ پر بالاتفاق مسح ناجائز ہے۔ رہی تیسری قسم منعل تو اس میں اختلاف ہے امام شافعی و امام احمد رحمہما اللہ اس پر بھی مسح کے

جواز کے قائل ہیں۔البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر مسح جائز نہیں ہے۔احناف متقدمین کی عبارات اس سلسلہ میں خاموش ہیں البتہ متاخرین میں سے اکثر کی رائے عدم جواز ہی کی ہے۔(چنانچہ حضرت الاستاذ کو اکثر دارالافتاء سے یہی فتویٰ موصول ہوا ہے)

فائدہ......**مسح علی الجوربین** کے سلسلہ میں تین روایات حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی وارد ہوئی ہیں۔جن میں سے دوضعیف ہیں اور تیسری روایت مختلف فیہ ہے۔(دروس مدنیہ ص ۱۷۶ ج۱) غرضیکہ کوئی روایت اس قابل نہیں ہے جس کی بنا پر کتاب اللہ میں زیادتی ممکن ہو۔البتہ مسح علی الخفین تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اس لئے جوربین کی جن اقسام میں خفین والی شرائط پائی جائیں گی ان کو اشتراک علت کی بنا پر خفین کا حکم دے دیا جائے گا اور ان پر مسح جائز ہوگا اور جن میں وہ شرائط نہیں پائی جائیں گی،ان کو خفین کا حکم نہیں دیا جائے گا۔اس لئے ان پر مسح بھی جائز نہ ہوگا۔

المسح علی العمامة

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ......مسح علی العمامہ جائز ہے یہی قول امام اوزاعی و اسحاقؒ کا ہے۔

دلیل......حدیث نبوی:''**ومسح علی الخفین والعمامة**'' کہ آپ ﷺ نے خفین اور عمامہ پر مسح فرمایا(ترمذی:۱/۲۹) نیز حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے، کہ آپ ﷺ نے ایک سریہ بھیجا ان لوگوں کو سردی لگی پھر جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عمامہ ور خفین پر مسح کرنے کا حکم فرمایا۔(ابوداؤد ص ۱۹ ج۱)

جواب......جن احادیث سے مسح علی العمامہ کا ثبوت ملتا ہے،ان کے جمہور کی جانب سے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔(۱) مسح علی العمامہ کی احادیث اخبار آحاد ہیں جن سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ قرآن کریم میں صرف سر پر مسح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔(۲) جن روایات میں مسح علی العمامہ مذکور ہے وہ مختصر ہیں اصل میں''**مسح علی ناصیته و عمامته**'' تھا جیسا کہ دوسری روایات (ترمذی ص ۲۹، ج۱) سے معلوم ہوتا ہے۔(۳) مسح علی العمامہ کی روایات کا ایک جواب امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں یہ دیا ہے کہ وہ منسوخ ہوچکی ہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... مسح علی العمامہ جائز نہیں ہے۔

دلیل...... قرآن کریم کی آیت: ''وامسحوا برء وسکم'' ہے جو کہ اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ مقدار مفروض کا مسح (جو کہ حنفیہ کے یہاں ربع رأس، شافعیہ کے یہاں ایک بال یا تین بال ہے) سر پر ہی کیا جائے گا کسی اور چیز پر نہیں۔ البتہ مقدار فرض کے بعد بقیہ سر پر جو مسح کرنا سنت ہے وہ سنت عمامہ پر کرنے سے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟ تو امام احمد وامام شافعیؒ کے نزدیک باقی مسح عمامہ پر کرنے سے سنت ادا ہو جائے گی۔ حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک ادا نہیں ہوگی۔

خمار...... (عورتوں کی اوڑھنی) پر مسح میں وہی اختلاف ہے جو مسح علی العمامہ میں ہے۔

التیمم

یہاں دو مسئلے ہیں: (۱) تیمّم میں ضربیں کتنی ہوں گی۔ (۲) مسح کہاں تک کیا جائے گا۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... تیمّم میں صرف ایک ضرب ہوگی، اور ہاتھوں کا مسح رسغین (یعنی گٹوں) تک کیا جائے گا۔

دلیل...... حضرت عمارؓ والی حدیث ہے: ان النبی ﷺ امرہ بالتیمم للوجه والکفین (ترمذی:۱/۳۶) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرنے کا حکم فرمایا۔ اس حدیث میں ہاتھوں کیلئے کفین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا اطلاق صرف رسغین تک ہوتا ہے لہٰذا اس حدیث سے رسغین تک مسح ثابت ہوتا ہے اسی طرح حضرت عمار رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری احادیث سے ایک ضرب کا ثبوت ملتا ہے۔ (مسلم ص ۱۶۱ ج ۱)

جواب...... چونکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ جنابت کا تیمّم بھی وہی ہے جو حدثِ اصغر کا ہے، اس لئے انہوں نے حالت جنابت میں تیمّم کے قصد سے پورے بدن کو مٹی سے لگایا، اس کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کو پورا تیمّم کر کے تو نہیں دکھایا، البتہ عملی طور پر تھوڑا سا تیمّم کی طرف اشارہ کر کے دکھا دیا، یہی اشارہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے، اب اگر اس اشارے کے طور پر کئے ہوئے تیمّم (یعنی ایک ضرب اور رسغین تک مسح) کو ہی کوئی پورا تیمّم سمجھنے لگے تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

امہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں ہیں کہ...... تیمّم کے لئے دو ضربیں ہوں گی۔ ایک چہرے

کے لئے دوسری ہاتھوں کے لئے، اور یدین کا مسح مرفقین تک ہوگا۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: **عن جابرؓ عن النبی ﷺ قال التیمم ضربة للوجه و ضربة للذّراعين الى المرفقين.** (دار قطنی: ۱/۱۸۱) کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تیمّم میں ایک ضرب چہرہ کیلئے اور ایک ضرب ہاتھوں کے لئے ہے کہنیوں تک۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع حدیث ہے: **عن النبی ﷺ قال التیمم ضربتان ضربة للوجه وضربة لليدين الى المرفقين۔** (دار قطنی: ۱/۱۴۰، ومستدرک: ۱/۱۷۹، ط: نظامیہ حیدر آباد)

یہ احادیث صراحتاً اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ تیمّم میں دوضربیں ہیں اور یدین کا مسح مرفقین تک ہے نہ کہ رسغین تک۔

الفرق بين غسل الرجل والمرأة

عورت اور مرد کے غسل میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... عورت اور مرد دونوں کے غسل میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر اصول شعر تک پانی پہنچ جائے تو بال کھولنا ضروری نہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... غسل جنابت میں دونوں کے لئے بال کھولنا ضروری نہیں البتہ غسل حیض ونفاس میں عورت کے لئے بالوں کا کھولنا ضروری ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اگر عورت کے اصول شعر تک پانی پہنچ جائے تو بال کھولنا ضروری نہیں، خواہ غسل جنابت ہو یا غسل حیض ونفاس، لیکن مرد کے لئے بہر صورت بالوں کو کھولنا ضروری ہے۔

دلیل...... مرد اور عورت کے غسل میں یہ فرق حضرت ثوبانؓ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں ہے کہ: **اما الرجل فلينشر رأسه فليغسله** (ابو داؤد: ۱/۳۴) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مرد اپنے سر (کے بالوں) کو کھول لے پھر غسل کرے۔ معلوم ہوا کہ مرد کے لئے بالوں کو کھولنا ہر حال میں ضروری ہے اور عورت کے بارے میں ارشاد فرمایا: **و اما المرأة فلا** (حوالہ بالا) معلوم ہوا کہ عورت کے (اصول شعر تک اگر پانی پہنچ جائے تو اس کے) لئے کھولنا ضروری نہیں ہے۔ اور یہی ہمارا مسلک ہے۔

کتاب الصلوٰۃ

الفرق بین الایمان والکفر الصلاۃ

ایمان وکفر کے درمیان حد فاصل نماز ہے

جو شخص قصداً نماز نہ پڑھے اس کا کیا حکم ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... ''تارک الصلوٰۃ عمداً'' کافر ومرتد ہے۔

دلیل...... حضرت بریدہؓ کی روایت ہے۔ ''ان العهد الذی بیننا وبینهم الصلوٰة فمن ترکها فقد کفر'' (ترمذی کتاب الایمان، نسائی کتاب الصلوٰۃ) یہ حدیث اور اس مضمون کی وہ تمام احادیث جن میں کفر کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ امام احمدؒ کا مستدل ہیں۔

جواب...... (۱) حدیث مستحل پر محمول ہے۔ (۲) کفر سے مراد کفردون کفر ہے۔ (۳) فقد کفر ای فعل فعل الکفرة (۴) حدیث زجر پر محمول ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ..... تارک الصلوٰۃ کافر نہیں، مؤمن ہے۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے ''ان اللّٰه لا یغفر ان یشرک به ویغفر مادون ذٰلک لمن یشآء'' (سورۃ النسآء پ۵) (۲) حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی روایت ہے جس میں ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں جو شخص ان کے لئے اچھے طریقے سے وضو کرے گا اور ان کو خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے وقت پر پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کی مغفرت کا وعدہ ہے اور جو شخص اس طرح نہیں کرے گا تو اللہ کا اس کے ساتھ کوئی عہد نہیں۔ اللہ کو اختیار ہے خواہ اس کی مغفرت کرے یا عذاب دے۔ (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ)

پھر اگر توبہ نہ کرے تو امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ردّۃ (مرتد ہونے) کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔

دلیل...... حدیث نبوی ﷺ ہے: ''من بدّل دینه فاقتلوه'' (ترمذی وابوداؤد، کتاب الحدود)

امام مالک وشافعی رحمہما اللہ کے نزدیک..... تعزیراً قتل کیا جائے گا۔

دلیل......(۱) آیت کریمہ ہے ”فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فخلّوا سبیلھم “۔(سورۃ التوبۃ پ۱۰)(۲) حدیث نبوی ﷺ ہے: امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوہ عصموا منی دمائھم واموالھم وحسابھم علی اللہ. (مسلم ج ۱ کتاب الایمان)

آیت کریمہ اور حدیث پاک میں جان کی عصمت کا موقوف علیہ تین باتیں (توحید و رسالت کا اقرار، ادائیگی نماز اور ادائیگی زکوٰۃ) قرار دی گئی ہیں۔ان میں سے جو بھی مفقود ہوگا، جان و مال کی عصمت منتفی ہو جائے گی۔

جواب......اقاتل سے مراد قتال (جنگ) ہے قتل نہیں۔اس بات کی تائید قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتی ہے: فقاتلوا التی تبغی حتّٰی تفئی الی امر اللہ۔(سورہ حجرات پ۲۶)

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......قید کیا جائے گا یہاں تک کہ توبہ کر کے نماز شروع کرے یا پھر اسی حالت (قید) میں موت آ جائے۔

عدم قتل پر دلیل......حدیث نبوی ﷺ ہے: ”لا یحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الہ الا اللہ، وانّی رسول اللہ، الاّ باحدیٰ ثلاث، الثّیب الزّانی والنّفس بالنّفس، والتارک لدینہ “(بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی) یہی مذہب راجح ہے اور اعتدال پر مبنی ہے۔

هل يُقضى التطوع أم لا؟

نفل عبادت کی قضا ہوگی یا نہیں؟

نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد اس کا پورا کرنا نیز اگر درمیان میں کسی عذر کی بناء پر فاسد ہو جائے تو اس کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟

امام اعظمؒ کے نزدیک......نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد پورا کرنا واجب ہے، اگر کسی بنا پر وہ درمیان میں فاسد ہو جائے تو اس کی قضا بھی لازم ہے۔(ایضاح البخاری:۱/۳۹۸)

دلیل......آیت کریمہ: (۱)”لا تبطلوا اعمالکم “(سورۃ محمد پ۲۶) اور ولیوفوا نذورھم (سورۃ الحج، پ۱۷) ہے، پہلی آیت صریح

دلیل ہے۔اور دوسری آیت سے استدلال یوں ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ اپنی نذروں کو پورا کرو اور نفل عبادت بھی شروع کرنے کے بعد نذر بن جاتی ہے۔ اس لئے اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہوگا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جس عبادت کا پورا کرنا ضروری ہو اگر وہ درمیان میں ہی فاسد ہو جائے تو قضاء لازم آتی ہے۔معلوم ہوا کہ نفل عبادت کی قضاء واجب ہوگی۔(۲) نفلی حج شروع کر کے فاسد کر دینے سے تمام ائمہ کے نزدیک اس کی قضا واجب ہے حالانکہ اس میں مشقت زیادہ ہے تو نماز روزہ شروع کر کے توڑنے سے بطریق اولیٰ قضا لازم ہوگی؛ کیونکہ حج کی بنسبت سہل ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور اگر درمیان میں کسی عذر کی وجہ سے فاسد ہو جائے تو اس کی قضاء واجب نہیں ہے۔

دلیل......وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی نفل روزہ رکھتے، پھر افطار فرمالیا کرتے تھے۔(نسائی کتاب الصوم وایضاح البخاری ۳۹۸/۱) یعنی روزہ توڑ دیا کرتے تھے،اس سے معلوم ہوا کہ نفل عبادت کا شروع کرنے کے بعد پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔

جواب......اس کا یہ ہے کہ حدیث پاک سے صرف حضور اکرم ﷺ کا روزہ توڑنا ثابت ہے مگر آپ ﷺ نے اس روزے کی قضاء بھی فرمائی یا نہیں تو حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔لیکن ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے اس کی قضاء نہ فرمائی ہوگی بلکہ غالب یہی ہے کہ آپ ﷺ نے ضرور بالضرور اس کی قضاء فرمائی ہوگی۔جیسا کہ دوسری احادث سے اس کی تائید ہوتی ہے، کہ جب بھی کوئی نفل عبادت توڑتا تھا تو آپ ﷺ اس کو قضا کی تاکید فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہؓ نے نفلی روزہ رکھا پھر اس کو توڑ دیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: **تقضی یوماً مکانهٗ** کہ اس کے بدلے کسی دوسرے دن روزہ رکھ لینا۔(دارقطنی بحوالہ ایضاح البخاری ص۴۰۰ ج۱)

ان جیسی احادیث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھی ضرور اس روزے کی قضا فرمائی ہوگی۔اس لئے اس حدیث سے عدم وجوب قضا ثابت کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

دلیل مشترک......اس مسئلہ میں فریقین ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں۔اور دونوں ہی

اس سے استدلال کرتے ہیں جو کہ نہایت اہم ہے۔اس لئے خوب اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں۔حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ایک اعرابی کو چند فرائض کی تعلیم دی آپ ﷺ نے سب سے پہلے پانچ نمازوں کا ذکر فرمایا، اس اعرابی نے دریافت کیا کہ اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی نماز فرض ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں ''الا ان تطوع'' اس کے بعد دوسرے فرائض کا ذکر فرمایا تو ان کے بعد بھی اعرابی نے وہی سوال کیا آپ ﷺ نے ہر بار یہی ارشاد فرمایا کہ نہیں: ''الا ان تطوع''۔(مسلم:۱/۳۰ بخاری:۱/۱۲)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......حدیث پاک میں نفل کو فرائض سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔اور یہ استثناء استثناء منقطع ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ نفل عبادت فرائض کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف ہے یعنی جس طرح فرائض شروع کرنے کے بعد پورے کرنے ضروری ہیں، اور اگر درمیان میں فاسد ہوجائیں تو قضا لازم آتی ہے، نفل میں یہ بات نہیں ہوگی۔نہ اس کو شروع کرنے کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہوگا اور نہ ہی درمیان میں فاسد ہونے سے قضا واجب ہوگی۔

جواب......(استثناء میں) اصل استثناء متصل ہے منقطع غیر اصل ہے اور اصل کو چھوڑ کر غیر اصل اس وقت مراد لیا جاتا ہے جب کہ اس پر کچھ قرائن موجود ہوں، اور یہاں قرائن صحیحہ موجود نہیں ہیں، اس لئے غیر اصل (منقطع) مراد لینا بھی صحیح نہیں ہوگا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... یہاں استثناء متصل ہے یعنی نفل فرض کی جنس سے ہے چنانچہ جس طرح فرض کو شروع کرنے کے بعد پورا کرنا اور اگر درمیان میں فاسد ہوجائے تو اس کی قضا کرنا لازم ہوتا ہے نفل میں بھی شروع کرنے کے بعد اس کو پورا کرنا اور اگر درمیان میں فاسد ہوجائے تو اس کی قضا کرنا واجب ہوگا۔

وقت الظهر والعصر

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......ایک مثل پر ظہر کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

دلیل......حدیث نبوی ہے جس میں یہ ہے کہ:''ثم صلى العصر حين كان ظلُّ كلّ شيء مثليه ''(ترمذی ص ۳۸ ج ا باب فی مواقیت الصلوٰۃ) کہ پھر جبرئیل علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھائی جس وقت کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر

ہوگیا تھا۔ معلوم ہوا کہ مثل اول پر ظہر کا وقت ختم ہو کر عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

جواب...... حدیث جبرئیل علیہ السلام وقت عصر کے سلسلہ میں منسوخ ہے، کیونکہ وہ مکی ہے اور دوسری احادیث جن سے مثلین کا ثبوت ملتا ہے وہ مدنی ہیں اس لئے یہ حدیث حجت نہیں بن سکتی۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

دلیل...... حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: **قال، قال رسول الله ﷺ اذا اشتد الحر فابردوا عن الصلوٰة فان شدة الحر من فيح جهنم۔** (ترمذی: ۱/۴۰، بخاری: ۱/۷۶، مسلم: ۱/۲۲۴، ابوداؤد ص ۵۸/۵۹) کہ جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لئے کہ شدت حرارت جہنم کے جوش مارنے کی وجہ سے ہے۔ اس حدیث میں شدت حرارت کی صورت میں نماز ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور عرب کے علاقہ میں ایک مثل تک سخت گرمی رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ نماز ظہر کا وقت ایک مثل کے بعد بھی رہتا ہے۔

نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عصر کی نماز پڑھائی جس وقت کہ ہر چیز کا سایہ دو مثل ہوگیا تھا۔ (تنظیم الاشتات ص ۲۲۲ ج ۱) یہ حدیث بھی حنفیہ کے مذہب پر صریح ہے کہ عصر کا وقت مثلین پر شروع ہوتا ہے۔

التغليس بالفجر

امام شافعی و امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... نماز فجر غلس (صبح صادق کے بعد کی تاریکی) میں پڑھنا افضل ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: **اِنْ كَانَ رسول الله ﷺ ليصلي الصّبح فينصرف النسآء متلفعات بمروطهن، مايعرفن من الغلس** (خ: ۸۶۷، م: ۱۴۵۷، ت: ۱۵۳) کہ آپ ﷺ فجر کی نماز پڑھاتے تھے اور عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی اس طرح واپس ہوتی تھیں کہ غلس کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز غلس میں پڑھتے تھے۔ نیز حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی غلس میں ہی نماز پڑھا کرتے تھے۔

جواب......(۱) حدیث مذکور میں ''**من الغلس**'' کا لفظ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نہیں ہے بلکہ ان کا قول تو **مایعرفن** پر ختم ہوگیا، اور ان کا منشاء یہ تھا کہ عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی آتی تھیں اس لئے انہیں کوئی پہچانتا نہیں تھا، کسی راوی نے یہ سمجھا کہ نہ پہچاننے کا سبب اندھیرا تھا اس لئے اس نے ''**من الغلس**'' کا لفظ بڑھا دیا۔ (۲) ابن ماجہ: ۱/ ۴۹ و مسلم میں اسی مضمون کی ایک حدیث موجود ہے جس سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ رہا مسئلہ حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کا تو ان کا غلس میں نماز شروع کرنا تو ثابت ہے مگر وہ نماز کو غلس ہی میں ختم کرتے تھے یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اس کا برعکس ثابت ہے۔ (۳) یہ آپ ﷺ کا اپنا عمل تھا امت کے لئے یہ حکم نہیں ہے بلکہ ان کے لئے اسفار کی ہدایت ہے۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......نماز فجر اسفار میں پڑھنا افضل ہے۔

دلیل......حدیث مرفوع ہے: ''**اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر**'' (ترمذی ص ۴۰ ج ۱) نیز بخاری شریف میں ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز سے ایسے وقت فارغ ہوتے تھے جب کہ آدمی اپنے ساتھی کو پہچان لیا کرتا تھا۔ (بخاری: ۱/ ۷۸) اور ایک دوسرے کو پہچاننا روشنی ہی میں ہوسکتا ہے اندھیرے میں نہیں معلوم ہوا کہ نماز فجر اسفار ہی میں پڑھنا افضل ہے۔

الوقت المستحب للظهر

تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سردی میں تعجیل افضل ہے، البتہ گرمی میں نماز ظہر کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک......گرمی میں بھی نماز ظہر میں تعجیل افضل ہے، یہی ایک روایت امام احمد رحمہ اللہ کی ہے۔

دلیل......(۱) حدیث نبوی ہے: **کان اشد تعجیلاً للظهر** (ترمذی) کہ آپ ﷺ ظہر میں بہت زیادہ تعجیل کرنے والے تھے۔ (۲) **عن علیؓ ان النبی ﷺ قال یا علی ثلث لا تؤخرها الصلوٰة اذا أتت**......الخ (ترمذی) کہ اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرنا پہلی نماز جبکہ اس کا وقت آجائے الخ۔ اس حدیث سے مطلقاً تعجیل معلوم ہوتی ہے۔ **وعن ام فروةؓ قالت سئل النبی ﷺ ای الاعمال افضل قال الصلوة لاول وقتها**۔ (ترمذی) اس

حدیث سے بھی تعجیل صلوٰۃ کا افضل ہونا واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

جواب...... پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ کا سردی میں معمول تھا اور سردی میں ہم بھی تعجیل ظہر کے قائل ہیں۔ دوسری اور تیسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ ان میں نماز کا اول وقت مراد نہیں ہے بلکہ وقت مستحب کا اول حصہ مراد ہے۔ (کذافی المرقاۃ)

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک ...... سردی میں تعجیل افضل ہے اور گرمی میں تاخیر افضل ہے۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: اذا اشتد الحر فابر دوا بالصلوٰۃ فان شدّۃ الحرّ من فیح جھنم (ترمذی) کہ جب گرمی سخت ہو تو نماز کو تاخیر سے پڑھو اس لئے کہ شدت حرارت، جہنم کے جوش مارنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نیز حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث ہے: کان النبی ﷺ اذا اشتد البرد بکر بالصلوٰۃ و اذا اشتد الحر ابر د بالصلوٰۃ (بخاری: ۱/۷۶) کہ نبی پاک ﷺ جب سردی تیز ہوتی تھی تو نماز کو سویرے پڑھتے تھے اور جب گرمی تیز ہوتی تھی تو نماز کو دیر سے پڑھتے تھے ان تمام احادیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سردی میں جس طرح تعجیل افضل ہے گرمی میں تاخیر اور ابراد افضل ہے۔

الوقت المستحب للعصر

ائمہ ثلاثہ رحمھم اللہ کے نزدیک ...... نماز عصر میں تعجیل افضل ہے۔

دلیل...... حدیث پاک میں ہے: عن عائشۃ ان النبی ﷺ کان یصلی العصر والشمس فی حجر تھا (ترمذی) کہ آپ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ دھوپ ابھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوتی تھی۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ان النبی ﷺ کان یصلی العصر والشمس مرتفعۃ حیۃ فیذھب الذاھب الی العوالی فیا تیھم والشمس مرتفعۃ وبعض العوالی من المدینۃ اربعۃ امیال او نحوہ (بخاری ومسلم)۔ اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: یقول کنا نصلی العصر مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم ننحر الجزور فنقسم عشر قسم ثم نطبخ فنا کل لحماً نضیجا قبل مغیب الشمس (مسلم) کہ ہم

عصر کی نماز پڑھ کر اونٹ ذبح کرتے تھے پھر اس کو دس حصوں میں تقسیم کرتے تھے پھر پکاتے تھے اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی تازہ گوشت کھاتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے اتنا کام عصر کی نماز سویرے پڑھ لینے سے ہی ہوسکتا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم اول وقت میں پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس لئے نماز عصر میں تعجیل افضل ہے۔

جواب...... پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ نیچا تھا۔ اور دروازہ بھی چھوٹا تھا اور اس کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ اسی سے حجرے میں دھوپ داخل ہوتی تھی۔ تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجرے میں دھوپ کی موجودگی کے وقت نماز پڑھتے تھے تو اس سے تو تاخیر ثابت ہوگی نہ کہ تعجیل۔ اس لئے کہ جانب مغرب میں واقع نیچے دروازے میں اسی وقت دھوپ داخل ہوگی جبکہ سورج نیچے آ گیا ہو، اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ ان حضرات کا معاملہ (غروب ہونے کیلئے) ہے جو تیز چلنے والے تھے یا پھر گرمی کے موسم کا واقعہ ہے کیونکہ گرمیوں میں مابین العصر والمغرب کافی فاصلہ ہوتا ہے۔ اور تیسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ اگر قصاب اور طباخ ماہر ہوں تو اتنا کام عصر سے مغرب تک مستبعد نہیں ہے۔ اور اہل عرب کی بڑے بڑے ٹکڑے بنانے اور نیم پختہ کھانے کی عادت سے اس کی مزید تائید ہو جاتی ہے۔ جو کہ آج بھی اہل عرب میں جاری ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... نماز عصر میں اصفرار سے پہلے تک تاخیر افضل ہے۔

دلیل......(۱) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد تعجیلا للظهر منكم وانتم اشد تعجیلا للعصر منه (ابوداؤد) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر میں تم سے زیادہ جلدی کرنے والے تھے اور تم عصر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تعجیل کرنے والے ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصر میں تعجیل نہیں فرمایا کرتے تھے۔ (۲) ایک دوسری حدیث میں ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یؤخر العصر مادامت الشمس بیضاء نقیة (ابوداؤد) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر کو اس وقت تک مؤخر کرتے تھے جب تک کہ

سورج صاف رہتا تھا۔ یہ حدیث تاخیر کے ثبوت میں صریح ہے۔(۳) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یأمر بتاخیر صلاة العصر (مسند احمد، مجمع الزوائد ص۳۰۷ ج۱) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عصر کو مؤخر کرنے کا حکم فرماتے تھے۔ تاخیر عصر کے استحباب کی اس سے واضح اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے۔ غرضیکہ ان تمام احادیث میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نماز عصر میں تاقبل اصفرار تاخیر افضل ہے۔

الصلوٰۃ عند الطلوع والغروب

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ اگر عصر کی نماز ادا کرتے ہوئے سورج غروب ہو جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا فجر کی نماز ادا کرتے ہوئے اگر سورج طلوع ہو جائے تو نماز باطل ہو گی یا نہیں؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... فجر کی نماز کے دوران سورج طلوع ہونے سے نماز باطل نہیں ہوگی۔

دلیل......(۱) حدیث ابوہریرہؓ: ان النبی ﷺ قال من ادرک رکعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک الصبح (بخاری و مسلم) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے پوری نماز پالی۔(۲) حدیث: من ادرک سجدة الصبح قبل ان طلع الشمس فلیتم صلوته (بخاری) ''جس نے سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز فجر کا ایک سجدہ پالیا وہ اپنی نماز پوری کرلے'' ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے مثل فجر کی نماز بھی طلوع شمس سے فاسد نہیں ہوگی۔

جواب......(۱) حدیث مذکورہ میں ''فقد ادرک'' کا معمول محذوف ہے اور وہ یا تو لفظ وقت ہے یا لفظ ثواب ہے یا پھر لفظ وجوب ہے۔ یعنی من ادرک رکعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک وقت الصلوٰۃ او ثواب الصلوٰۃ او وجوب الصلوٰۃ۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص نے فجر کی ایک رکعت اس کے وقت میں پالی تو گویا اس نے فجر کا وقت پالیا۔ یا (نیت کا اعتبار کرتے ہوئے) اس نے گویا نماز کا ثواب پالیا یعنی وقت کے اندر نماز کی ادائیگی کے ثواب کا مستحق ہو گیا یا اس نے نماز کے

وجوب کو پالیا۔ یعنی اب اس پر اس کی قضا لازم ہوگئی۔ (۲) محرّم اور مبیح میں تعارض کے وقت محرّم کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ ''فلیتم صلوته'' کے معنی ''فلیأت بها علی وجه التمام'' کے ہیں یعنی اس نماز کو اب دوسرے وقت میں کامل طریقہ پر ادا کرے اسی وقت ناقص ادا نہ کرے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... دوران فجر طلوع شمس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے یہی مسلک امام محمد رحمہ اللہ کا ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے ان رسول الله ﷺ قال لا تحرّوا لصلوتكم عند طلوع الشمس وعند غروبها، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ طلوع شمس اور غروب شمس کے وقت نماز کیلئے تحرّی مت کرو۔ نیز جن احادیث سے عدم فساد مفہوم ہوتا ہے۔ وہ ان احادیث کے معارض ہیں جن میں اوقات مکروہہ میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے تعارض کی وجہ سے قیاس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور قیاس یہی کہتا ہے کہ عصر کی نماز فاسد نہ ہو۔ کیونکہ وہ ناقص وقت میں شروع ہونے کی وجہ سے ناقص واجب ہوئی تھی چنانچہ ناقص ہی ادا ہوجائے گی۔ لیکن فجر کا آخری وقت ناقص نہیں ہوتا۔ اس لئے فجر کے آخری وقت میں نماز شروع کرنے والے پر فجر کی نماز کامل واجب ہوئی ہے اور جب کامل واجب ہوئی ہے تو کامل ہی ادا کرنی ہوگی، ناقص ادا نہیں کی جاسکتی۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اگر دوران فجر طلوع شمس ہوجائے تو نماز میں توقف اختیار کرے اور وقت مکروہ گزر جانے پر اتمام کرے۔ یہ نماز نفل ہوجائے گی۔

من نسی الصلوٰة

اگر کسی آدمی سے نوم (نیند) یا نسیان کی وجہ سے نماز رہ جائے تو وہ کس وقت اِس کی قضا پڑھے؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اگر وقتِ مکروہہ نہ ہو تو بیدار ہونے یا، یاد آجانے پر (اسی قضا نماز کو) پڑھ لے۔ بالفاظِ دیگر...... امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اوقاتِ مکروہہ (طلوع، زوال، غروب) میں قضا نماز پڑھنا ناجائز ہے۔

دلیل......(۱) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے چند حضرات نے جن کی سچائی اور دینداری میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جاسکتا ہے اور جن میں سب سے زیادہ میرے محبوب حضرت عمرؓ تھے۔ بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد سورج بلند ہونے تک، عصر کی نماز کے بعد سورج ڈوبنے تک، نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری باب الصلوٰۃ بعد الفجر، ومسلم) (۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یتحرّی احدکم فیصلی عند طلوع الشمس ولا عند غروبھا'' (بخاری ومسلم واللفظ للبخاری) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص نہ سورج طلوع ہونے کے وقت نماز پڑھے اور نہ غروب ہونے کے وقت۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......جس وقت بیدار ہو یا جس وقت یاد آجائے اسی وقت وہ نماز پڑھ لے، اگرچہ وقت مکروہہ ہو۔

دلیل......حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''قال قال رسول اللہ ﷺ من نسی صلوٰۃ فلیصلّھا اذا ذکرھا'' (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، واللفظ للترمذی باب فی الرجل ینسی الصلوٰۃ) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو نماز (ادا کرنا) بھول جائے تو جب اسے یاد آجائے، پڑھ لے۔ نیز ترمذی میں اس سے ماقبل باب کی حدیث میں ہے: ''فاذا نسی احدکم صلوٰۃ او نام عنھا فلیصلّھا اذا ذکرھا''۔

جواب...... یہ روایات اخبار احاد ہیں جبکہ نہی کی روایات متواتر ہیں۔ اس لئے یہ روایات منسوخ ہیں یا اوقاتِ غیر مکروہہ کے ساتھ خاص ہیں۔

الجمع بین الصّلوٰتین

جمع کی دو قسمیں ہیں: (۱) جمع حقیقی (۲) جمع صوری۔

جمع حقیقی......ایک نماز کے وقت میں دو نمازوں کو پڑھنا۔

جمع صوری......دو نمازوں کو صرف صورتاً جمع کرنا، بایں طور کہ ایک نماز کو اپنے وقت کے آخری حصہ میں پڑھے، اور دوسری نماز کو اپنے اوّل وقت میں پڑھے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......جمع صوری جائز اور جمع حقیقی صرف عرفات اور

مزدلفہ میں جائز ہے، اس کے علاوہ (دوسرے مواقع میں) ناجائز ہے۔

دلیل......(۱) قرآن کریم کی آیت ہے: ''ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً'' کہ بے شک نماز مؤمنوں پر اپنے وقت میں فرض کی گئی ہے۔(۲) امامتِ جبرائیل علیہ السلام والی حدیث کہ آپ علیہ السلام نے اوقاتِ صلوٰۃ کی تعلیم دینے کے لئے دو دن آ کر رسول اللہ ﷺ کو امامت کرائی۔(ابوداؤد ج۱، باب فی المواقیت) (۳) ترمذی میں حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی نماز کے اوقات معلوم کرنے کے لئے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن اس کو مدینہ میں رکھا اور عملاً اوقاتِ صلوٰۃ کی تعلیم دی۔(ترمذی، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......جمع حقیقی (جمع بین الصلوٰتین) مطلقاً جائز ہے۔

دلیل......حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ''قال جمع رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ تبوک بین الظهر والعصر وبین المغرب والعشاء'' (ترمذی و مسلم واللفظ للثانی، باب الجمع بین الصلوٰتین فی الحضر) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں ظہر اور عصر کی نمازوں اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع فرمایا ہے۔

جواب......حدیث جمع صوری پر محمول ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سفر میں ایک نماز آخر وقت میں پڑھی، تھوڑا سا انتظار کیا، پھر دوسری نماز اس کے اوّل وقت میں پڑھی، پھر فرمایا: ''انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا عجل به امر صنع مثل الّذی صنعتُ'' (ابوداؤد، باب الجمع بین الصلوٰتین)

الترجیع فی الاذان

کلمات اذان کی تعداد میں اختلاف ہے جس کا مدار ترجیع پر ہے، ترجیع کے معنی ہیں کہ اذان میں جو شہادت والے چار کلمے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دو دو مرتبہ کہا جائے پہلے آہستہ آواز سے پھر زور سے، اس صورت سے یہ کلمات بجائے چار کے آٹھ ہو جاتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......اذان میں ترجیع افضل ہے اس لئے کلمات اذان جو کہ پندرہ تھے اب ترجیع کو شامل کر کے ان کے نزدیک انیس ہو جائیں گے۔

دلیل......حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان میں ترجیع سکھائی تھی۔(مسلم شریف ص ۱۶۵ ج ۱، ترمذی ص ۴۸ ج ۱)

جواب......اس حدیث کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔(۱) وہ ترجیع نہیں تھی بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کی غرض سے اذان کو بار بار دھروایا تھا۔(۲) پہلی مرتبہ جو حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے چار کلمے کہلوائے تھے وہ اذان کے نہیں تھے، بلکہ وہ تو ان کو مسلمان کرنے کیلئے تھے، البتہ دوسری مرتبہ جو کہلوائے تھے، وہ اذان کے تھے، اس لئے اذان میں کلمہ شہادت چار ہی رہے۔(۳) حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اذان کا یہ اختلاف قرآن کی سات قرأتوں کے اختلاف کی طرح ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک کا پڑھنا جائز ہے۔ یہی صورت یہاں ہے کہ ترجیع اور عدم ترجیع دونوں جائز ہیں۔ البتہ ہم نے عدم ترجیع کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ مؤذن رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی روایت جو کہ اذان کے باب میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے بغیر ترجیع کے وارد ہوئی ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک......بھی اذان میں ترجیع افضل ہے، لیکن انہوں نے شروع والی چار تکبیروں میں سے دو تکبیریں ختم کر دیں، اس لئے ان کے نزدیک کلمات اذان سترہ رہ گئے۔

دلیل......ترجیع کے ثبوت میں ان کی دلیل وہی ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ کی ہے۔

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......اذان میں ترجیع افضل نہیں ہے اس لئے کلمات اذان صرف پندرہ ہیں۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہما کو جو خواب میں اذان سکھلائی گئی تھی اس میں ترجیع نہیں تھی۔(ابوداؤد ص ۷۲ ج ۱) نیز حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری عمل بھی عدم ترجیع کا ہے۔(شرح معانی الآثار کتاب الصلوٰۃ باب الاقامۃ کیف ہی ج ۱)

کلمات الاقامۃ

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک......اقامت میں گیارہ کلمات ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک شروع والی تکبیر صرف دو مرتبہ اور شہادتین وحیعلتین ایک ایک مرتبہ ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک.....کلمات اقامت صرف دس ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک قد قامت الصلوٰۃ بھی ایک مرتبہ ہے۔(یعنی ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ،کلماتِ اقامۃ میں افراد کے قائل ہیں)

دلیل......یہ حضرات کلمات اقامت کے ایک ایک مرتبہ ہونے پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کرتے ہیں جس میں ہے کہ: ''امر بلال ان یشفع الاذان ویوتر الاقامۃ ''اس حدیث میں اقامت کوطاق عدد کے ساتھ کہنے کا حکم دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقامت صرف ایک مرتبہ کہی جائے گی۔(ترمذی ص۴۸ج۱ومسلم ص۱۶۴ج۱)

جواب......علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں تشفیع (دودو مرتبہ کہنا) اور ایتار(یعنی ایک ایک مرتبہ کہنا) دونوں کا ثبوت ملتا ہے،اس لئے ایتار کے جواز میں تو کوئی کلام نہیں۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ترجیح کس کو دی جائے گی۔چنانچہ حنفیہ نے تشفیع کو ترجیح دی۔کیونکہ حضرت عبداللہ بن زیدؓاور حضرت بلالؓ کا آخری عمل یہی منقول ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک.....کلمات اقامت سترہ ہیں جن میں پندرہ کلمات اذان والے ہیں اوران میں دو مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

دلیل......حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم علّمہ الا ذان تسع عشرۃ کلمۃ والاقامۃ سبع عشرۃ کلمۃ. (ترمذی،نسائی) نیز وہ تمام روایات امام اعظم رحمہ اللہ کے مستدل ہیں۔جن میں شفعاً شفعاً اور مثنیٰ مثنیٰ کے الفاظ آئے ہیں،یعنی کلمات اقامت کو دودو مرتبہ ادا کیا جائے۔اوراس صورت میں کلمات اقامت قد قامت الصلوٰۃ کے اضافہ کے ساتھ سترہ ہوجاتے ہیں اوریہی ہمارا مسلک ہے۔

الأذان قبل الوقت

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک......فجر کے علاوہ باقی ساری نمازوں میں اذان قبل الوقت معتبر نہیں ہے۔البتہ فجر کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ وامام ابویوسفؒ کے نزدیک......اذان فجر صبح صادق سے پہلے جائز ہے۔

دلیل......حدیث عبداللہ بن عمرؓ مرفوعاً: ان بلالا یؤذّن بلیل فکلوا

واشربوا حتی تسمعوا اتاذین ابن ام مکتوم (ترمذی ج۱ باب الاذان باللیل وابوداؤد) کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں (مگر) تم کھاتے پیتے رہو جب تک کہ ابن ام مکتوم کی اذان نہ سن لو۔ ملاحظہ فرمائیے اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت بلالؓ صبح صادق سے پہلے اذان دیتے تھے۔ اور رات میں کوئی اور نماز ہے نہیں اس لئے لازماً وہ فجر کی ہی اذان ہوگی۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے: لا یغرنکم اذان بلال عن السحور فانہ یؤذّن بلیل۔ (بذل المجہود:۲/۳۰۵) کہ تم کو بلال کی اذان سحری کے بارے میں دھوکہ میں نہ ڈال دے اس لئے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں۔ اس حدیث سے بھی اذان قبل الفجر کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ ان دلائل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اذان فجر قبل الوقت جائز ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ متعدد احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت بلالؓ رات میں تہجد کے لئے اذان دیتے تھے۔ اس لئے تہجد کی اذان سے یہ ثابت کرنا کہ فجر کی اذان قبل الوقت ہوتی تھی صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے: عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال لا یمنعن احدکم اذان بلال من سحورہ فانہ یؤذّن بلیل لینبّہ نائمکم، کہ تم میں سے کسی کو بلال کی اذان سحری کھانے سے ہرگز نہ روکے اس لئے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں تاکہ تمہارے سونے والے کو جگائیں۔ دیکھئے اس حدیث سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اذان بلال برائے تہجد تھی، برائے فجر نہ تھی اس لئے اس کو فجر کی اذان کہہ کر قبل الوقت اذان کو جائز قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ اذان فجر ہوتی تو ابنِ ام مکتوم رضی اللہ عنہ دوبارہ اذان کیوں دیتے۔

امام اعظمؒ وامام محمدؒ کے نزدیک...... اذان فجر قبل الوقت جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت بلالؓ کی روایت ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال لہ لا تؤذّن حتی یستبین لک الفجر ھکذا ومدیدیہ عرضاً (ابوداؤد:۱/۸۹) کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب تک فجر اس طرح واضح نہ ہو جائے اذان مت دیا کرو۔ اور آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ عرضاً پھیلا کر دکھائے۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے: قالت ما کانوا یؤذّنون حتی ینفجر الفجر (الدرایۃ:ص۶۴) ان احادیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی اذان طلوع فجر کے بعد ہوتی تھی۔ اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے اگر اذان فجر طلوع کے بعد دی گئی تو معتبر ہوگی ورنہ نہیں۔

حكم الاجرة بالأذان

اذان و امامت، تعلیم قرآن وفقہ اور ان جیسی دوسری عبادات پر اُجرت لینے کے جواز اور عدمِ جواز میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ و احمدؒ کے نزدیک...... اذان اور تعلیم قرآن وغیرہ پر اُجرت لینا ناجائز ہے۔

دلیل...... (۱) قرآن پاک کی آیت ہے: **قل ما اسئلکم علیه من اجر** (سورۂ ص والشعراء) (۲) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: **قال انّ من اٰخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اتّخذ مؤذّناً لا یأخذ علی اذانه اجراً** ۔ (ترمذی، ابو داؤد، نسائی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت مجھے یہ تھی، کہ میں ایسا مؤذن مقرر کروں جو اذان پر اجرت نہ لے۔

امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک...... اذان اور تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینا جائز ہے۔

دلیل...... حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ کے چند صحابہؓ سفر میں تھے۔ دورانِ سفر عرب کے ایک قبیلہ میں ان کا قیام ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے قبیلہ والوں سے میزبانی کا تقاضا کیا، لیکن انہوں نے انکار کیا۔ اتفاقاً اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کے پاس آ کر انہوں نے جھاڑ پھونک کے بارے میں پوچھا اس پر ایک صحابیؓ نے فرمایا: بخدا میں اسے جھاڑ دوں گا لیکن چونکہ تم لوگوں نے ہماری میزبانی سے انکار کر دیا، اس لئے اب میں اجرت کے بغیر نہیں جھاڑ سکتا۔ آخر بکریوں کے ایک ریوڑ پر قبیلہ والوں کے ساتھ معاملہ طے ہو گیا اور جب آپ ﷺ کے سامنے واقعہ ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی اور اجرت کو جائز قرار دیا۔ (بخاری باب ما یعطی فی الرقیۃ الخ، مسلم، ترمذی)

جواب...... رقیہ پر اجرت لینا سب کے ہاں جائز ہے، حدیث میں اسی کا ذکر ہے۔

متاخرین احناف رحمہم اللہ کے نزدیک...... اذان و اقامت، تعلیم قرآن اور ان جیسے دوسرے وہ اہم امورِ دینیہ جن پر دین اسلام کی بقاء موقوف ہے، ان پر اجرت لینے کے جواز

کا فتویٰ دیا ہے۔ (ہدایہ ج ۴ و بحر الرائق ج ۱، کتاب الاجارۃ) اور جن امورِ دینیہ پر اسلام کی بقاء موقوف نہیں، ان پر اجرت لینا ناجائز ہے۔ (ردالمختار)

حکم الجماعة

ظاہریہ...... کے نزدیک جماعت فرض عین اور صحت صلوٰۃ کیلئے شرط ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... جماعت فرض عین ہے مگر صحت صلوٰۃ کیلئے شرط نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... جماعت فرض کفایہ ہے۔

دلیل...... یہ حضرات صلاۃ الخوف والی آیت سے استدلال کرتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فاذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ**......الخ، اس آیت میں دوران جہاد نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جہاں پر خوف کے علاوہ بہت سے منافیات صلاۃ بھی پائے جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت قائم کرنا فرض ہے اور جب جہاد میں جماعت فرض قرار پائی تو امن کی حالت میں بطریق اولیٰ فرض ہوگی۔

نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: **ان رسول اللہ ﷺ قال والذی نفسی بیدہ لقد ھممت ان آمر بحطب فیحطب ثم آمر بالصلوٰۃ فیؤذّن لھا ثم آمر رجلا فیؤمّ الناس ثم اخالف الیٰ رجال فاحرق علیھم بیوتھم.** (بخاری ومسلم) اس حدیث میں "**متخلفین عن الجماعة**" کے بارے میں آپ ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے کہ "میرا دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں" اور اتنی سخت زجر وتوبیخ فرض ہی پر ہوسکتی ہے غیر فرض پر نہیں۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے: **من سمع النداء فلم یاتہ فلا صلوٰۃ لہ الا من عذر** (ابن ماجہ) کہ جس شخص نے اذان کی آواز سنی، پھر بھی مسجد میں نہیں آیا، تو اس کی نماز نہیں ہوگی، الا یہ کہ کوئی عذر ہو۔ اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے: **لا صلوٰۃ لجار المسجد الافی المسجد** (ابوداؤد) کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوگی ان احادیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جماعت قائم کرنا فرض ہے۔

جواب...... صلوٰۃ الخوف والی آیت کا جواب یہ ہے کہ میدان جہاد میں جماعت قائم کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس لئے نہیں کہ اقامت جماعت فرض ہے۔ بلکہ اس لئے دیا

گیا ہے تا کہ نماز رحمت خداوندی اور نصرت غیبی کا ذریعہ بنے، کفار کے دلوں میں مسلمانوں کے اطمینان وسکون اور ان کی جمعیت دیکھ کر رعب قائم ہو۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے "**متخلفین عن الجماعة**" کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ سب جماعت میں شرکت کی تاکید کیلئے تھا اس لئے نہ تھا کہ جماعت فرض ہے۔ ورنہ آپ ﷺ اس موقع پر ضرور اس کی صراحت فرماتے، اور دوسری اور تیسری حدیث میں جو **لا صلوٰة** کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں لانفی کمال کیلئے ہے نفی صحت کیلئے نہیں ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مسجد میں آ کر نماز نہیں پڑھیں گے تو نماز کامل درجہ کی نہ ہوگی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز ہی نہ ہوگی۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... جماعت سنت موکدہ اشدتاکید ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: **قال النبی ﷺ صلوٰة الجماعة تفضل صلوٰة الفذ بسبع وعشرين درجة.** (بخاری ومسلم) کہ جماعت کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز تنہا پڑھی جانے والی نماز سے ستائیس درجہ افضل ہے۔ اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر جماعت کے پڑھی جانے والی نماز بھی ہو جاتی ہے البتہ اس کو فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ اگر جماعت فرض ہوتی تو تنہا پڑھنے کی صورت میں نماز ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ معلوم ہوا کہ جماعت فرض نہیں ہے۔ لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جماعت پر مواظبت ثابت ہے اس لئے سنت مؤکدہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام وہ احادیث بھی حنفیہ کا مستدل ہیں جو جماعت کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔ کیونکہ ان سے جماعت کا افضل ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر فرض ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

(والتفصیل فی التعلیق الصبیح ص ۳۷، ج ۲، فتح الملہم ص ۲۱۸، ج ۲، عینی ص ۶۸۵، ج ۲)

حكم الجماعة الثانية

جو مسجد عام راستے پر واقع ہو، اس میں بالاتفاق جماعت ثانیہ بلا کراہت جائز ہے۔ البتہ محلّہ کی مسجد، جس میں امام اور وقت متعین ہو، ایسی مسجد میں جماعت ثانیہ کے بارے میں ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال مختلف ہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......جس مسجد میں جماعت ہوچکی ہو، اس میں دوبارہ جماعت (کرانا) مکروہ ہے۔

دلیل......حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ''انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقبل من نواحی المدینة یرید الصلوٰة، فوجد النّاس قد صلّوا، فمال الیٰ منزله فجمع اهله، فصلّی بهم ''(طبرانی کبیر واوسط) اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر دوسری جماعت مکروہ نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں ادا فرماتے۔

امام احمد، اسحٰق وابوداوٗد ظاہری رحمہم اللہ کے نزدیک......مسجد میں دوسری جماعت (کرانا) بلاکراہت جائز ہے۔

دلیل......حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: قال جاء رجل وقد صلّی رسول الله صلی الله علیه وسلم، فقال: ایّکم یتّجر علی هٰذا، فقام رجل و صلّی معه''(ترمذی وابوداوٗد)

جواب......اختلاف اس صورت میں ہے کہ امام ومقتدی دونوں مفترض ہوں، یہاں مقتدی متنفّل تھے، اس لئے استدلال درست نہیں۔

الصلوٰة خلف الصّفّ وحده

اگر کوئی آدمی صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہوکر نماز پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......نماز ہوجاتی ہے لیکن کراہت کے ساتھ۔

دلیل......حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے: ''انه انتهیٰ الی النبی ﷺ وهو راکع، فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذالک اللنبی ﷺ فقال زادک الله حرصاً ولا تعد''۔(بخاری باب اذا رکع دون الصّف'' کتاب الاذان'' ابوداوٗد، نسائی) کہ وہ (ابوبکرہؓ) مسجد میں آئے اور آپ ﷺ رکوع کی حالت میں تھے انہوں نے صف کے پیچھے ہی سے رکوع کرلیا۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ تمہارے شوق کو اور زیادہ کرے، لیکن دوبارہ ایسا نہ کرنا۔

ملاحظہ فرمائیے، اگر نماز باطل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی (حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ) کو نماز کے اعادے کا حکم فرماتے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......نماز باطل ہے۔

دلیل......حضرت وابصہؓ سے روایت ہے:ان رجلا صلّی خلف الصف وحده فامره رسول الله ﷺ ان يعيد الصّلوٰة ۔(ترمذی باب الصلوٰۃ خلف الصف وحدہ) کہ ایک آدمی نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نماز لوٹانے کا حکم فرمایا۔

جواب......(۱) یہ حدیث مضطرب ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔(بدایۃ المجتہد ج ۱)(۲) اعادے کا حکم استحباب پر محمول ہے۔

من احق بالامامة

امامت کیلئے یوں تو بہت سے اوصاف کا ذکر ملتا ہے،جیسا کہ:ورع وتقویٰ تقدم فی الهجرة سنّ،علم اور قرأت وغیرہ۔لیکن اختلاف اخیر کے دو وصفوں یعنی علم وقرأت میں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک......اَقْرَأ اَعْلَمُ پر مقدم ہوگا۔یہی رائے امام ابو یوسف کی ہے۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:يؤمّ القوم اقرأهم لكتاب الله فان كانوا في القراءة سواء فأعلمهم بالسنة (مسلم وابو داوٗد) کہ لوگوں کی امامت وہ کرے گا جو قرآن کریم کو سب سے زیادہ اچھا پڑھنے والا ہوگا۔اور اگر پڑھنے میں سب برابر ہوں تو پھر جو دین کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوگا وہ امامت کرے گا۔اس حدیث میں اقرأ کو اعلم پر مقدم کیا گیا ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامت کا حقدار پہلے اقرأ ہے نہ کہ اعلم۔اسی طرح حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:قال رسول الله ﷺ اذا كانوا ثلثة فليؤمّهم احدهم واحقهم بالقراءة اقرأهم (مسلم شریف) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم تین آدمی ہو،تو چاہئے کہ تم میں سے ایک سب کی امامت کرے،اور ان میں سے امامت کا زیادہ حقدار قرآن کریم کو زیادہ اچھا پڑھنے والا ہے۔اس حدیث میں بھی،احق بالامامة اقرأ کو قرار دیا گیا ہے۔

جواب......ایسی تمام روایات جن میں اقرأ کو اعلم پر مقدم کیا گیا ہے،ان کا جواب یہ ہے کہ ان میں اقرأ سے اعلم ہی مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں لوگ قرآن کریم کو احکام سے واقف ہوتے ہوئے پڑھتے تھے چنانچہ جو جتنا بڑا قاری ہوتا وہ اتنا ہی بڑا عالم اور

فقیہ بھی ہوتا تھا۔ (عینی ص ۲۳۷ ج ۲)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ: کے نزدیک......اعلم اقرأ پر مقدم ہوگا۔

دلیل...... حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے **انہ مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاشتد مرضہ فقال علیہ السلام مروا ابا بکر فلیصل بالناس** (بخاری شریف) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوگئے اور مرض بڑھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلم اقرأ پر مقدم ہوگا۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امامت کا حکم فرمایا اور وہ اعلم تھے جیسا کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا قول ہے: **کان ابو بکر اعلمنا** حالانکہ وہاں اقرأ یعنی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا: ''**اقرأ کم ابی بن کعب**'' پس چونکہ آخری عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلم کو اقرأ پر مقدم فرمایا ہے اس لئے اعلم اقرأ کے مقابلے میں امامت کا زیادہ حقدار ہوگا۔

التکبیرۃ التحریمۃ

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... نماز صیغہ تکبیر سے شروع کرنا فرض ہے اگر صیغہ تکبیر کے علاوہ کسی اور لفظ سے نماز شروع کی تو نماز نہیں ہوگی۔ یہی قول امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ہے۔ پھر ائمہ ثلاثہ وامام ابو یوسف رحمہم اللہ کے درمیان صیغہ تکبیر کی تعیین میں اختلاف ہے چنانچہ امام مالک وامام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک صیغہ تکبیر صرف لفظ ''اللہ اکبر'' ہے، امام شافعی رحمہ اللہ ''اللہ اکبر'' کے ساتھ ''اللہ الاکبر'' (معرف باللام) کے بھی قائل ہیں۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک صیغہ تکبیر چار ہیں۔ ''اللہ اکبر'' ''اللہ الاکبر'' ''اللہ کبیر'' ''اللہ الکبیر''۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: **تحریمھا التکبیر** ۔ (ترمذی ص ۵۵، ج ۱، ابوداؤد ص ۹۱، ج ۱) کہ نماز کا تحریمہ تکبیر ہے، اس حدیث میں التکبیر خبر ہے اور قاعدہ ہے کہ خبر اگر معرف باللام ہو تو حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی حصر کے معنی پیدا ہوں گے، اور مطلب یہ ہوگا کہ نماز صرف تکبیر ہی سے شروع کی جاسکتی ہے کسی اور لفظ سے نہیں۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث بالا خبر واحد ہے اور خبر واحد سے وجوب تو ثابت ہوسکتا ہے،

فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی، اس لئے حدیث مذکور کی بنا پر صیغہ تکبیر کو فرض کہنا صحیح نہیں ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... نماز کا شروع کرنا ہر ایسے ذکر سے فرض ہے جو مشعر تعظیم ہو، صیغہ تکبیر کی خصوصیت نہیں جیسے ''اللہ اجلّ''، ''اللہ اعظم'' وغیرہ، البتہ حدیث مذکور اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت کی بنا پر لفظ ''اللہ اکبر'' سے نماز شروع کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اسی لئے اگر کسی نے اس کے علاوہ کسی اور لفظ سے نماز شروع کی تو فرضیت تو ادا ہو جائے گی، مگر ترک واجب کی بنا پر نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

دلیل...... صیغہ تکبیر کی عدم فرضیت پر احناف کی جانب سے آیت کریمہ ''**وذکر اسم ربہ فصلّٰی**'' (سورۃ الاعلیٰ) پیش کی جاتی ہے جس میں صرف اللہ کا نام لیکر نماز شروع کرنے کو کہا گیا ہے، صیغہ تکبیر کا کوئی ذکر نہیں ہے نیز ''**تحریمها التکبیر**'' بھی چونکہ خبر واحد ہے اس لئے اس سے بھی عدم فرضیت کا ثبوت ملتا ہے۔

وضع الیدین

یہاں دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھے جائیں گے یا نہیں؟

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... قول مشہور کی بنا پر فرائض میں ارسال (ہاتھوں کو سیدھا چھوڑ دینا) بہتر ہے جبکہ نوافل میں وضع۔ [درس آثار السنن بحوالہ بدایۃ المجتہد]

دلیل...... اس مسئلے میں ان کی جانب سے کوئی حدیث پیش نہیں کی جاتی، البتہ ایک عقلی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ٹیک لگانا ہے، اور ٹیک لگانا نوافل میں تو مطلقاً جائز ہے مگر فرائض میں بلا ضرورت مکروہ ہے (حوالہ مذکورہ) چنانچہ اسی دلیل کی بنیاد پر انہوں نے نوافل میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کو بلا کراہت جائز کہا اور فرائض میں بلا ضرورت مکروہ قرار دیا ہے۔

جواب...... جمہور رحمہم اللہ کی جانب سے مذکورہ عقلی دلیل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ہاتھ باندھنے کے ثبوت میں احادیث موجود ہیں اس لئے احادیث کے مقابلے میں عقلی دلیل کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ: فرماتے ہیں کہ...... نوافل اور فرائض دونوں میں ہاتھ باندھنا مسنون ہے۔

دلیل...... اس سلسلہ میں بہت سی احادیث مروی ہیں چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے: ''**ثم وضع یده الیمنی علی**

الیسریٰ"(مسلم:۱/۱۷۳)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع یدین سنت ہے۔دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہاتھ کہاں باندھے جائیں گے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ......سینہ کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا مستحب ہے۔

دلیل......اس مسئلہ میں کوئی صحیح یا صریح حدیث ان کے پاس موجود نہیں ہے۔(معارف السنن:۲/۴۴۵) اس لئے وہ "علیٰ صدرہ "والی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے:قال صلیت مع رسول اللہ ﷺ فوضع یدہ الیمنی علیٰ یدہ الیسری علیٰ صدرہ (صحیح ابن خزیمہ:۱/۲۴۳،والتلخیص الحبیر :۱/۲۲۴) کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر سینہ کے اوپر رکھا۔

جواب......مذکورہ حدیث کا مدار مؤمل بن اسمٰعیل پر ہے اور وہ ضعیف ہیں۔(آثار السنن ص ۶۵ ج ۱)اس لئے حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا مستحب ہے۔

دلیل......حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے:ان من السنۃ وضع الکف علی الکف فی الصلوۃ تحت السرۃ (مسند احمد ص ۱۱۰ ج ۱،وابوداوٗد کتاب الصلوٰۃ) کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت میں سے ہے۔

اور اصول حدیث کا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی صحابی من السنۃ کہہ کر کوئی بات بیان کرتا ہے تو وہ مرفوع کے درجہ میں ہوتی ہے چنانچہ اس اصول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذکورہ اثر بھی حدیث مرفوع کے حکم میں ہوگا۔

امام احمد رحمہ اللہ......آپ رحمہ اللہ سے اس سلسلہ میں تین روایتیں منقول ہیں،ایک امام شافعی رحمہ اللہ کے مطابق ایک امام اعظم رحمہ اللہ کے مطابق اور تیسری یہ ہے کہ دونوں کے درمیان اختیار ہے۔

التسمیۃ جزء من القران

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں جو"بسم اللہ"لکھی ہوئی ہے۔

یہ سورۃ کا جزء ہے یا پورے قرآن کا جزء ہے۔
امام اعظم وصاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک...... ''بسم اللہ'' ہر ہر سورۃ کی آیت اور جزء نہیں، بلکہ سورتوں کے مابین فصل کے لئے ہے۔ البتہ پورے قرآن کا جزء (آیت) ہے سوائے سورۂ نمل کے۔

دلیل......(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: ''کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایعرف فصل السورۃ حتّٰی تنزل علیه ''بسم الله الرحمن الرحیم '' (ابوداوٗد باب من جهر بها) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سورۃ مبارکہ کا، دوسری سورۃ سے جدا ہونا نہ جانتے تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر'' بسم اللہ......الخ'' نازل ہوئی''۔ (۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث قدسی مروی ہے: ''سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول '' قال الله عزّوجلّ قسمتُ الصّلوٰۃَ بینی وبین عبدی نصفین، ولعبدی ماسأل فاذا قال العبد الحمد لله ربّ العٰلمین ''اھ (مسلم باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، ترمذی کتاب التفسیر، وابوداوٗد)

ملاحظہ فرمایئے: اگر تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہوتا، تو اس سے ابتداء کی جاتی، حالانکہ اللہ عزوجل کے قول میں ابتداء ''الحمد للہ'' سے ہوئی نہ کہ ''بسم اللہ'' سے۔ معلوم ہوا کہ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں ہے۔ (۳) حضرت انسؓ کی روایت ہے: ''کان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر وعثمان یفتحون القراء ۃ'' بالحمد لله ربّ العٰلمین '' (ترمذی، ابو داوٗد، نسائی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ، عمرؓ وعثمانؓ قراءت کو'' الحمد لله ربّ العٰلمین '' سے شروع کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......تسمیہ ہر ہر سورۃ کا جزء (آیت) ہے۔

دلیل......حضرت انسؓ کی روایت ہے: ''یقول قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم انزلت علیّ آنفاً سورۃ فقرأ بسم الله الرحمن الرحیم انّا اعطینک الکوثر حتّیٰ ختمها '' (مسلم، ابوداوٗد، نسائی واللفظ لابی داوٗد) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ابھی ابھی ایک سورۃ نازل ہوئی ہے، پھر وہ سورۃ پڑھی اور فرمایا: بسم الله الرحمن الرحیم انّا

اعطینک الکوثر اھ۔ یہاں تک کہ پوری سورۃ تلاوت فرمائی۔
جواب...... آپ ﷺ نے ''بسم اللہ'' تبرکاً پڑھی تھی جزئیت کی وجہ سے نہیں۔ اس پر قرینہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی مذکورہ بالا روایات ہیں۔

التسمیة قبل الفاتحة

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... تسمیہ قبل الفاتحہ مشروع نہیں ہے بلکہ بدعت ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے کہ جب ان کے صاحبزادے نے نماز میں بسم اللہ پڑھی تو انہوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ بدعت ہے۔ (ترمذی ص ۵۷ ج ۱)

جواب...... انہوں نے بسم اللہ پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا بلکہ اس کے جہر سے منع فرمایا تھا۔
امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... جہری نمازوں میں جہر کے ساتھ اور سری نمازوں میں سر کے ساتھ تسمیہ مسنون ہے۔

دلیل...... (۱) اس مسئلہ میں ان کی سب سے مضبوط دلیل حضرت نعیم بن المجمر کی روایت ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، تو انہوں نے پہلے بسم اللہ پڑھی پھر سورۃ فاتحہ پڑھی الخ۔ (سنن نسائی ص ۱۴۴ ج ۱) (۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھاتے ہوئے بسم اللہ نہیں پڑھی تو چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ آپ نے نماز چرالی یا بھول گئے؟ اس کے بعد سے وہ ہمیشہ بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔ (دار قطنی ص ۳۱۱ ج ۱)

جواب...... پہلی روایت شاذ ہے، اور دوسری معلول اس لئے کوئی قابل حجت نہیں ہے۔
امام اعظم واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... ہر نماز میں سرّاً تسمیہ مسنون ہے۔

دلیل...... حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی، لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ الخ جہراً پڑھتے نہیں سنا۔ (مسلم ص ۱۷۲ ج ۱، نسائی ص ۱۴۴ ج ۱) یہ روایات صراحتاً دلالت کر رہی

ہے کہ بسم اللہ جہراً نہیں ہے۔ بلکہ سرّاً ہے۔

قرأة الفاتحة خلف الامام

امام شافعیؒ کے نزدیک.....مقتدی پر سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، خواہ جہری نماز ہو یا سری۔

دلیل.....حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرأت کرنی بھاری پڑ گئی پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ میں تم کو امام کے پیچھے قرأت کرتے دیکھ رہا ہوں، خبر دار، اللہ کی قسم (آئندہ) ایسا نہ کرنا سوائے سورۃ فاتحہ کے، اس لئے کہ اس کے بغیر کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ (ترمذی ۶۹، ۷۰ ج ۱)

جواب..... یہ ہے کہ حدیث مذکور صحیح نہیں ہے بلکہ معلول ہے۔ اس لئے اس سے فاتحہ کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک.....قرأت فاتحہ خلف الامام مکروہ تحریمی ہے، خواہ جہری نماز میں ہو یا سری نماز میں۔

دلیل.....آیت کریمہ ہے: واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا .....الخ، کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور چپ رہو۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ وحضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ نماز کی تعلیم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: واذا قرأ فانصتوا (مسلم: ۱/۱۷۴) کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ نیز حضرت جابرؓ کی روایت ہے: قال رسول اللہ ﷺ: من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (ابن ماجہ ص ۶۱) ان تمام احادیث سے بھی ثابت ہوا کہ امام کے پیچھے فاتحہ وغیرہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

امام مالک واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک..... جہری نماز میں فاتحہ خلف الامام مکروہ ہے البتہ سری نماز میں مستحب ہے۔ یہی قول امام محمد رحمہ اللہ کا ہے۔

التامین بالجهر والسر

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک.....آمین بالجہر افضل ہے۔

دلیل.....حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث ہے جو کہ حضرت سفیان ثوریؒ کی سند

سے آئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''سمعت رسول الله ﷺ قرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين وقال امين ومدبها صوته. (ترمذی ۱/۵۷) میں نے آپ ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے غير المغضوب عليهم ولا الضالين پڑھا اور امین کہا اور اس میں اپنی آواز کو کھینچا۔ امام شافعیؒ وامام احمدؒ اسی سے استدلال کرتے ہیں کہ آواز کو کھینچنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہراً امین کہا اسی لئے یہی افضل ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ آواز کو کھینچنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہراً آمین کہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آمین کی یاء کو لمبا کر کے ادا کیا اور اگر ہم مان بھی لیں کہ آپ ﷺ نے جہراً آمین کہا تھا تب بھی یہ حدیث آپ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے حضرت وائل بن حجرؓ کو سکھانے کی غرض سے نماز میں جہراً آمین کہا تھا جیسا کہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (کتاب الاسماء والکنی للدولابی بحوالہ آثار السنن)

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... آمین بالسر افضل ہے۔

دلیل...... حدیث مذکور ہے جو کہ شعبہؒ کی سند سے آئی ہے جس میں ''مد بها صوته'' کی جگہ ''خفض بها صوته'' وارد ہوا ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے پست آواز سے آمین کہا۔ حنفیہ و مالکیہ اس جملہ سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز میں آمین بالسر افضل ہے۔

رفع اليدين

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... رفع الیدین افضل ہے۔

دلیل...... ان حضرات کا سب سے بڑا مستدل حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے: رأيت رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوٰة يرفع يديه حتىٰ يحاذى منكبيه واذا ركع واذا رفع رأسه من الركوع (صحاح ستہ واللفظ للترمذی) کہ آپ ﷺ جب نماز شرع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھا لیتے (اسی طرح) جب رکوع میں جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے۔

جواب...... درحقیقت آنحضورﷺ سے رفع اور ترک دونوں ثابت ہیں۔ اس لئے ثبوت وعدم ثبوت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ مسئلہ صرف ترجیح کا ہے انہوں نے رفع کو ترجیح دی ہے اور ہم نے عدم رفع کو۔ ہمارے قول کی وجوہ ترجیح عنقریب آرہی ہیں۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... ترک رفع افضل ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ تم کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کر نہ دکھلاؤں۔ پھر انہوں نے نماز پڑھ کر دکھلائی اور سوائے تکبیر تحریمہ کے کہیں ہاتھ نہیں اٹھائے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ کہیں رفع یدین نہیں ہے۔ (ترمذی ص ۵۹ ج ۱) اس کے علاوہ بھی بہت ساری احادیث ہیں جن سے ترک رفع کا ثبوت ملتا ہے۔

وجوہ ترجیح...... (۱) ترک رفع کی روایات اوفق بالقرآن ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں ہے: وقوموا اللّٰہ قانتین، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ نماز میں کم سے کم حرکت ہو۔ (۲) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہر طرح کے اضطراب سے پاک ہے اور خود ان کا عمل بھی ترک رفع پر ہے۔ جبکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایتوں میں اختلاف بھی ہے اور خود ان کا عمل بھی ترک رفع کا ہے۔ (۳) علم کے دو بڑے مرکز مدینہ اور کوفہ کے اصحاب کا تعامل ترک رفع کا رہا ہے وغیرہ۔

تعدیل الارکان

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... تعدیل ارکان فرض ہے۔ اگر اس کو ترک کردیا تو نماز نہیں ہوگی، یہی قول امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ہے۔

دلیل...... حدیث ابو مسعود انصاریؓ مرفوعاً: **لا تجزئ صلوٰۃ لا یقیم فیھا الرجل یعنی صلبہ فی الرکوع والسجود** (ترمذی:۱/۶۱) کہ وہ نماز کافی نہیں ہوگی جس میں آدمی رکوع اور سجدوں میں اپنی کمر کو سیدھا نہ کرے۔ نیز حضرت خلاد بن رافعؓ کے واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب انہوں نے بغیر تعدیل کے نماز پڑھی تو آپؐ نے فرمایا: **ارجع فصلّ فانک لم تصلّ** (بخاری:۱/۱۰۹) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعدیل فرض اور ضروری ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ اخبار آحاد سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی زیادہ سے زیادہ وجوب ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا اخبار آحاد سے فرضیت تعدیل ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام اعظم و محمدؒ کے نزدیک...... تعدیل ارکان واجب ہے، فرض نہیں اسی لئے اگر کسی نے اس کو چھوڑ دیا تو فرضیت تو ادا ہوجائے گی، البتہ ترک واجب کی بناپر اعادہ صلوٰۃ ضروری ہوگا۔

دلیل......ان کا مستدل بھی حضرت خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس لئے کہ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعدیل ارکان کی تاکید فرمائی۔ اورارشادفرمایا کہ اگر تم نے اس (تعدیل) کو پوری طرح کیا تو تمہاری نماز بھی پوری ہوجائے گی، اور اگر اس میں کمی کی تو نماز بھی ناقص ہوگی۔ (ترمذی شریف ص ۶۶ ج۱) آپ ﷺ نے اس حدیث میں ترک تعدیل پر نماز کے باطل ہونے کا حکم نہیں لگایا بلکہ صرف ناقص فرمایا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعدیل ارکان فرض نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر تعدیل ارکان فرض ہوتی تو آپ ﷺ اس کے ترک ہوجانے پر نماز کے باطل ہونے کا فیصلہ فرماتے، صرف ناقص نہ بتلاتے۔

السجدة علی الجبهة والانف

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ سجدے میں پیشانی اور ناک دونوں کا ٹیکنا مسنون ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا کسی ایک پر اقتصار (اکتفاء) جائز ہے یا نہیں؟

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... سجدے میں پیشانی اور ناک دونوں کا ٹیکنا واجب ہے کسی ایک پر اقتصار جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حدیث پاک: **کان اذا سجد امکن انفه وجبهته الارض، الخ** (ترمذی:۱/۶۱) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو اپنی ناک اور پیشانی (دونوں) کو زمین پر ٹیک دیا کرتے تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ پیشانی اور ناک دونوں کا ٹیکنا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اقتصار علی الجبہہ تو جائز ہے مگر اقتصار علی الانف جائز نہیں ہے یہی مسلک اکثر مالکیہ وصاحبین رحمہم اللہ کا ہے۔

دلیل...... حضرت عباسؓ کی حدیث ہے: **انه سمع رسول الله ﷺ یقول" اذا سجد العبد سجد معه سبعة آراب وجههٗ وكفّاه وركبتاه**

وقدماہ'' (ترمذی:۱/۵۹)اس حدیث میں سات اعضاء کوسجدے کی حالت میں زمین پر رکھنے کا ذکر ہے، کفین، رکبتین، قدمین اور وجہ۔اور وجہ کا رکھنا صرف پیشانی رکھنے سے تو متحقق ہوجاتا ہے، اس لئے اقتصار علی الجبہۃ جائز ہوگا۔مگر صرف ناک رکھنے سے متحقق نہیں ہوتا،اس لئے اقتصار علی الانف جائز نہیں ہوگا۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ......دونوں میں سے کسی ایک کے رکھنے سے بھی سجدہ ادا ہوجائے گا۔

دلیل......قرآن کریم میں لفظ سجود آیا ہے اور سجود کہتے ہیں چہرے کو ہیئت تعظیم کے ساتھ زمین پر رکھنے کو پس چہرے کا جو حصہ بھی تعظیم کے ساتھ زمین پر رکھ دیا جائے گا سجدہ ادا ہوجائے گا، **اس لئے اقتصار علی الجبہۃ بھی جائز ہوگا** اور اقتصار علی الانف بھی۔**البتہ کراہت آئے گی۔**

فائدہ......امام اعظم رحمہ اللہ کا یہ **قول قدیم ہے** ورنہ بعد میں ان کا صاحبین رحمہم اللہ کے قول کی طرف رجوع ثابت ہے۔

جلسة الاستراحة

پہلی اور تیسری رکعت کے دوسرے سجدے کے بعد جلسۂ استراحت کے بارے میں ائمہ رحمہم اللہ کے اقوال میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ، مالک واوزاعی رحمہم اللہ کے نزدیک......جلسۂ استراحت مسنون نہیں ، بلکہ اس کے بجائے سیدھا کھڑا ہوجانا افضل ہے۔

دلیل......(۱) حضرت ابوہریرہؓ کی ''مُسیٔ فی الصلوٰۃ'' والی روایت ہے۔جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے **مُسیٔ الصّلوٰۃ** (حضرت خلاد بن رافعؓ) کو نماز کا صحیح طریقہ ارشاد فرمایا ہے، اور پہلی رکعت کے دوسرے سجدہ کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا ہے۔اس میں جلسۂ استراحت کا کوئی ذکر نہیں، اور حدیث بھی قولی ہے، جو اُمت کے لئے **قانون کی حیثیت رکھتی ہے**۔(۲) ترمذی (ج:۱ باب کیف النھوض من السجود سے اگلے باب) میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے:''**كان النبى صلی اللہ علیہ وسلم ينهض فى الصّلوٰة على صدور قدميه**'' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دونوں پاؤں کی انگلیوں پر زور دے کر کھڑے ہوجاتے تھے۔یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ

عنہم کے تعامل کی وجہ سے قابل قبول ہے۔ (فتح القدیر) چنانچہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی عمل مذکور ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... جلسۂ استراحت مسنون ہے۔

دلیل...... حضرت مالک بن الحویرثؓ کی روایت ہے: ''انــهٗ رأى النبى صلی اللہ علیہ وسلم يـصلى فاذا كان فى وتر من صلوته لم ينهض حتٰى يستوى قاعدًا '' (بخاری، ترمذی، واللفظ للاوّل) کہ انہوں نے (ابن الحویرثؓ) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب طاق رکعت میں ہوتے، تو اُس وقت تک نہ اُٹھتے، جب تک تھوڑی دیر بیٹھ نہ لیتے۔

جواب...... (۱) یہ حدیث حالت عذر پر محمول ہے۔ (۲) بیانِ جواز پر محمول ہے۔

قطع الصلوٰة بمرور الكلب والحمار والمرأة

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ...... اگر مصلی کے آگے سترہ نہ ہو تو کلب اسود کے گزرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور ایک روایت کے مطابق اس حکم میں حمار اور مرأۃ بھی داخل ہیں۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا صـلـى الـرجل وليس بين يديه كـأخرة الـرحل او كواسطة الـرحـل قـطـع صـلاته الكلب الاسود والمرأة والحمار (ترمذی شریف ص ۷۹ ج ۱؛ معارف السنن ص ۳۵۹ ج ۳) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر مصلی کے سامنے سترہ نہ ہو تو کلب اسود، عورت اور گدھے کے گزرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہاں قطع صلاۃ سے مراد افساد صلاۃ نہیں ہے بلکہ قطع الخشوع مراد ہے۔ (فتح الباری: ۲/۴۸۶، عمدۃ القاری: ۴/۲۷۳) کہ یہ تینوں چیزیں مصلی کے خشوع کو ختم کردیتی ہیں اور امام طحاویؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ قطع الصلوٰۃ کی احادیث منسوخ ہیں اور ناسخ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ وابن عباس رضی اللہ عنہما کی احادیث ہیں۔ (ترمذی ص ۷۹ ج ۱)

ائمہ ثلاثہؒ فرماتے ہیں...... کسی چیز کے مصلی کے آگے سے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

دلیل...... حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث ہے: قـال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لا يـقطع الصلاة شئى الخ (مشکوٰۃ: ۱/۷۴، ابن ابی شیبہ: ۱/۲۸) نیز حضرت

عائشہؓ کی حدیث ہے: قالت كان النبی صلی الله عليه وسلم يصلی وانا معترضة بينه وبين القبلة كاعتراض الجنازة (مشکوۃ ج۱ص۷۴) کہ نبی کریم ﷺ رات کو نماز پڑھتے رہتے تھے اور میں آپ ﷺ کے سامنے جنازے کی طرح لیٹی ہوتی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے کہ جب سامنے رہنے میں کسی مفسدہ کا خطرہ نہیں۔ تو مرور میں تو بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔

حكم الفاظ التسليم

ائمہ ثلاثہؒ وامام ابو یوسفؒ کے نزدیک...... لفظ، السلام علیکم، سے نماز ختم کرنا فرض ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص صیغہ سلام کے علاوہ کسی اور طریقے سے نماز ختم کرے تو نماز نہیں ہوگی۔

دلیل...... حدیث نبوی: "تحليلها التسليم" یعنی نماز سے حلال کرنے والی چیز سلام ہے۔ اس جملہ میں بھی خبر معرف باللام ہے اس لئے حصر کا فائدہ دے گی چنانچہ یہاں مطلب یہ ہوگا کہ نماز کو صرف لفظ السلام علیکم کے ذریعہ ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ کسی اور لفظ سے نہیں۔

جواب...... یہ خبر واحد ہے جس سے فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی صرف وجوب ثابت ہوسکتا ہے۔

امام اعظم ومحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... نماز کو ختم کرنا ایسے عمل سے فرض ہے جو کہ منافی صلوٰۃ ہو البتہ حدیث مذکور اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت کی وجہ سے لفظ سلام سے نماز ختم کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص لفظ سلام کے علاوہ سے نماز ختم کرے گا تو فرضیت تو ادا ہو جائے گی۔ مگر ترک واجب کی بنا پر نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

دلیل...... حدیث مذکور "تحليلها التسليم" ہے، یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے وجوب ثابت ہوسکتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد سکھا کر فرمایا تھا: "اذا قلت هذا أو قضيت هذا فقد قضيت صلوتك ان شئت ان تقوم فقم وان شئت ان تقعد فاقعد" (ابوداؤد ص۱۳۹) کہ جب تم اس کو پڑھ لو یا اس کو پورا کرلو تو تم نے اپنی نماز پوری کرلی، اب اگر چاہو تو کھڑے ہوجاؤ چاہے بیٹھے رہو۔ معلوم ہوا کہ تشہد کے بعد کوئی اور چیز فرض نہیں ہے۔

صلوۃ القائم خلف القاعد

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......امام قاعد کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، نہ کھڑے ہوکر نہ بیٹھ کر۔ البتہ اگر مقتدی بھی معذور ہوں اور کھڑے نہ ہو سکتے ہوں تو وہ ایسے امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

دلیل......حدیث پاک میں ہے: **لا یؤمّن رجل بعدی جالساً** ۔(مصنف عبدالرزاق ص ۴۶۳ ج ۲) کہ میرے بعد ہرگز کوئی بیٹھ کر نماز نہ پڑھائے۔

جواب......اس حدیث کا مدار جابر جعفی پر ہے، جو کہ متفق علیہ طور پر ضعیف ہے۔ اس لئے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......اگر امام معذور ہو تو اس کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھانا جائز ہے، اور مقتدی بھی ایسے امام کی بیٹھ کر ہی اقتداء کریں گے کھڑے ہو کر نہیں۔

دلیل......حدیث نبوی ہے: **واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اجمعون** ۔(ترمذی) کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے، تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔

جواب......(۱) یہ حدیث آپ ﷺ کے مرض الوفات والے واقعہ سے منسوخ ہے، جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ کرامؓ نے کھڑے ہو کر اقتداء کی۔ (۲) یہ حدیث نوافل سے متعلق ہے کیونکہ نوافل میں مقتدی کے لئے امام قاعد کی بیٹھ کر اقتدا کرنا جائز ہے۔ (۳) مذکورہ حکم اس وقت کے ساتھ خاص تھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود امام ہوں۔

امام اعظم وشافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......امام معذور کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھانا درست ہے۔ لیکن مقتدی (غیر معذور) کھڑے ہو کر اقتداء کریں گے۔

دلیل......آیت کریمہ ہے: **وقوموا للہ قانتین** ، اس آیت میں قیام کو علی الاطلاق سب کے حق میں فرض قرار دیا گیا ہے۔ خواہ امام ہو یا مقتدی، البتہ معذورین **لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا** کی وجہ سے اس حکم سے مستثنیٰ ہو جائیں گے۔ (۲) وہ ساری روایات بھی ہمارا مستدل ہیں جن میں قادر علی القیام کو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ (۳) آپ ﷺ نے مرض الوفات میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کھڑے ہو کر اقتداء کی۔ (بخاری)

شریف ص۹۶،۹۵ ج ا،مسلم شریف ص ۱۷۸،۱۷۷ ج ا) ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام قاعد کی غیر معذور مقتدی کھڑے ہو کر اقتداء کریں گے بیٹھ کر نہیں۔

صلوٰۃ المفترض خلف المتنفل

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... متنفل کے پیچھے مفترض کی اقتداء جائز ہے۔

دلیل...... حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ ہے: ان معاذ بن جبلؓ كان يصلي مع رسول الله ﷺ المغرب ثم يرجع الى قومه فيؤمّهم (ترمذی) کہ حضرت معاذ بن جبلؓ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نماز مغرب پڑھتے پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ جاتے اور ان کی امامت فرماتے تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جب ایک مرتبہ نماز پڑھ لی تو فرض ساقط ہو گیا اب وہی نماز اپنی قوم کو جا کر پڑھائی تو وہاں ان کی نفل ہو گی کیونکہ فرضیت تو پہلے ہی ادا ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلاة المفترض خلف المتنفل، جائز ہے۔

جواب...... نیت ایک معنوی چیز ہے، جس کے اوپر دوسرے کا مطلع ہونا بغیر صراحت کے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے حضرت معاذؓ نے حضور اکرم ﷺ کے پیچھے فرض کی نیت کی تھی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے پیچھے بہ نیت نفل شریک ہوئے ہوں اور قوم کی امامت بہ نیت فرض کی ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے جس سے عمومی حکم مستنبط نہیں کیا جا سکتا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... متنفل کے پیچھے مفترض کا اقتداء کرنا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے: سمعت رسول الله ﷺ لا تصلوا صلاة في يوم مرتين (معارف السنن ج ۵) کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ ایک دن میں دو مرتبہ ایک ہی نماز کو مت پڑھو۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: قال رسول الله ﷺ الامام ضامن والمؤذّن مؤتمن۔ (ترمذی: ۱/۵۰) کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام ضامن ہے اور مؤذن امین ہے اور امام مقتدیوں کی نماز کا اسی وقت ضامن ہو گا جبکہ دونوں کی نماز ایک ہو۔ اس لئے اگر امام متنفل ہے تو مفترض مقتدیوں کی نماز کا ضامن نہیں بن سکتا اور جب ضامن نہیں بن سکتا تو امام بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح

ایک دوسری حدیث میں ہے: **انما جعل الامام لیؤتمّ به** (ترمذی:۱/۵۰، مسلم ۱/۱۷۷، ترمذی:۱/۲۷، ابوداؤد:۸۹۱) کہ امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے۔ اور اقتداء کہتے ہیں کسی چیز میں مقتدیٰ کی پیروی کو۔ اور یہاں مقتدیٰ کی نماز نفل ہے جبکہ مقتدی فرض پڑھ رہے ہیں تو اقتداء کہاں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز درست نہیں ہوگی۔

سجدة السهو بعد السلام

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... سجدہ سہو قبل السلام افضل ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... سجدہ سہو بعد السلام افضل ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... اس مسئلہ میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر سجدہ سہو کسی نقصان کی وجہ سے واجب ہوا ہے تو قبل السلام افضل ہے، اور اگر کسی زیادتی کی وجہ سے واجب ہوا ہے، تو بعد السلام افضل ہے۔ اس کو آسانی کے ساتھ یاد رکھنے کے لئے یہ عبارت ذہن نشین کر لیں۔ **القاف بالقاف و الدال بالدال**، یعنی نقصان والا سجدہ قبل السلام اور زیادتی والا بعد السلام۔ یعنی **القبل بالنقصان و البعد بالزيادة.**

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ...... سجدہ سہو واجب کرنے والی متعدد صورتیں ہیں: پس جن صورتوں میں آپ ﷺ نے قبل السلام سجدہ فرمایا ہے وہاں یہی افضل ہوگا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بحینہؓ کی حدیث میں قعدہ اولیٰ کے ترک پر۔ اور جن صورتوں میں آپ ﷺ نے بعد السلام سجدہ فرمایا ہے وہاں بعد السلام ہی افضل ہوگا، جیسا کہ حضرت ذوالیدینؓ والی حدیث میں چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دینے کی صورت میں۔ ہاں وہ صورتیں جن میں آپ ﷺ سے کچھ منقول نہیں ہے، ان میں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق قبل السلام سجدہ کیا جائے گا۔ (غرضیکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ قبل السلام سجدہ کے قائل ہیں)

دلیل...... حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: **ان النبی ﷺ قام فی صلوٰة الظهر وعليه جلوس فلما اتم صلوته سجد سجدتين يكبر فی كل سجدة وهو جالس قبل ان يسلم**...... الخ (ترمذی:۱/۸۹) کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ ظہر کی نماز میں (دوسری رکعت میں) کھڑے ہو گئے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹھنا

تھا، پس جب آپ ﷺ نے اپنی نماز پوری کرلی تو دو سجدے فرمائے، ہر سجدے میں تکبیر بھی کہتے تھے، پھر آپ ﷺ بیٹھ گئے، سلام پھیرنے سے پہلے۔ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل السلام سجدہ سہو فرمایا ہے۔

جواب…… یہ ہے کہ حدیث مذکور جواز پر محمول ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لئے قبل السلام سجدہ فرمایا تھا۔

دلائل احناف……حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے: **ان النبی ﷺ الظهر خمساً فقيل له ازيد في الصلوٰة ام نيست؟ فسجد سجدتين بعد ماسلّم**۔ (ترمذی: ۱/۹۰) حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھادی، تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! نماز میں زیادتی کردی گئی ہے یا آپ سے بھول ہوگئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے فرمائے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سہو بعد السلام ہے، اسی طرح حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لكل سهو سجدتان بعد مايسلم** (ابوداؤد: ۱/۱۴۸) ہر سہو کیلئے دو سجدے ہیں سلام پھیرنے کے بعد۔ اس حدیث سے امام احمد و مالک رحمہما اللہ کی اس مسئلہ میں تفصیل اور ہر ایک کا الگ الگ حکم سب ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے مطلق ارشاد فرمایا ہے کہ ہر سہو کیلئے دو سجدے ہیں سلام پھیرنے کے بعد، اب خواہ وہ نقصان کا ہو یا زیادتی کا، یا کسی اور وجہ سے واجب ہوا ہو سب کا حکم ایک ہی ہوگا کہ سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کئے جائیں گے۔ نیز حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ کا واقعہ (ترمذی شریف: ۱/۸۷) بھی ہماری دلیل ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول سے چار رکعت کے بجائے دو رکعت پر سلام پھیر دیا، تو حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز اور پڑھائی اور سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے ادا فرمائے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سہو سلام پھیرنے کے بعد ہے نہ کہ سلام پھیرنے سے پہلے۔

من شک فی الصلوٰۃ کم صلی

اگر کسی آدمی کو نماز میں رکعات کی تعداد میں شک ہو جائے (کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں) تو وہ کیا کرے گا؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ...... ایسے آدمی کے لئے بناءعلی الاقل (متیقن پر عمل) اور آخر میں سجدہ سہو واجب ہے۔

دلیل......(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی مرفوع حدیث ہے: ''قال سمعتُ النبّی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا سها احدکم فی صلوته فلم یدر واحدةً صلّٰی اوثنتین، فلیبن علی واحدة الخ (ترمذی، ابن ماجہ) کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی نماز میں بھول جائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا ایک تو وہ ایک ہی شمار کرے، اور اگر دو اور تین میں شک ہو تو دو شمار کرے، پھر اگر تین اور چار میں شک ہو تو تین شمار کرے اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے۔(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: ''اذا شک احدکم فی صلوته فلیلق الشک ولیبن علی الیقین'' (مسلم، ابوداؤد) کہ جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو شک کو چھوڑ کر یقین پر بناء کرے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... قدرے تفصیل ہے: (۱) اگر شک پہلی بار آیا ہے تو اعادہ (استیناف) واجب ہے۔ (۲) اگر شک کی عادت ہے تو تحری کر کے غلبہ ظنّ پر عمل کرے۔ (۳) اگر غلبہ ظنّ حاصل نہ ہو سکے تو بناءعلی الاقول کرے اور سجدہ سہو کرے۔ نیز ہر اس رکعت پر قعدہ بھی کرے، جس کے آخری ہونے کا امکان ہو۔

استیناف کی دلیل...... حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی حدیث ہے: ''انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُئِل عن رجل سها فی صلوته فلم یدر کم صلّی، فقال علیه السلام لیعد صلوته'' (طبرانی کبیر) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز میں بھول جائے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسا شخص اپنی نماز

کو دوبارہ پڑھے۔ یہ حدیث مرسل ہے جو عندالجمہور قابل استدلال ہے۔

تحری کی دلیل...... حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے: "اذا شکّ احدکم فی صلوتہٖ فلم یدر أثلاثاً صلّٰی ام اربعا، فلیتحرّ الصّواب فلیتمّ علیه" (بخاری ومسلم) کہ جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے، تو یقینی صورت تک پہنچنے کی کوشش کرے، اور اسی کے مطابق نماز پوری کرے۔

بناء علی الاقل کی دلیل...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایتیں جو اوپر گزر چکیں۔

وجہ ترجیح مذہب امام اعظم رحمہ اللہ...... اِس مسئلہ میں چونکہ روایات مختلف ہیں۔ بعض میں اعادہ، بعض میں تحری اور بعض میں بناء علی الاقل اور سجدہ سہو کا ذکر ہے۔ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے بناء علی الاقل (بناء علی المتیقن) والی روایات پر عمل کرلیا اور بعض دوسری روایات کو ترک کر دیا، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تمام روایات میں تطبیق کر کے سب کو معمول بہا قرار دیا۔ اس لئے کے اِعمال بہتر وراجح ہے، اِہمال سے۔

القنوت فی الفجر

امام شافعی وامام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... نماز فجر میں قوت دائما مشروع ہے۔

دلیل...... حضرت براء بن عازبؓ کی مرفوع روایت ہے: ان النبی ﷺ کان یقنت فی صلاة الصبح والمغرب (معارف السنن:۴/۱۸) کہ آپ ﷺ فجر اور مغرب کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔ نیز حضرت انسؓ سے مروی ہے: مازال رسول اللہ ﷺ یقنت فی الفجر حتی فارق الدنیا۔ (معارف السنن:۴/۱۸) کہ نبی کریم ﷺ نماز فجر میں قنوت پڑھتے رہے، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نماز فجر میں ہمیشہ قنوت پڑھا کرتے تھے، اس لئے قنوت فی الفجر دائما مشروع ہے۔

جواب......(۱) جن احادیث میں قنوت فی الفجر کا ذکر ہے ان میں قنوت سے مراد قنوت نازلہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ جب بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی تھی تو قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے اور آپ ﷺ کا یہ معمول جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے آخر عمر تک رہا یہاں

تک کہ آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ ﷺ فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھا کرتے تھے۔ (۲) قنوت سے مراد قیام طویل ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ نماز فجر میں طویل قیام فرماتے تھے۔ (۳) حضرت انسؓ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ ان کی یہ حدیث صحیحین کی تخریج کردہ خود انہی کی حدیث کے معارض ہے، چنانچہ ان سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک مہینہ قنوت پڑھی ہے۔ (بخاری ۱۰۰۳، مسلم ۱۵۴۶) اس لئے ان کی یہ حدیث حجت نہیں بن سکتی۔

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ..... قنوت فی الفجر دائماً مشروع نہیں ہے۔

دلیل..... حضرت ابو مالک اشجعیؓ کی روایت ہے: قلت لابی یا ابت انک صلیت خلف رسول الله ﷺ وابی بکر وعمر وعثمان وعلی بن طبی طالب رضی الله عنهم ههنا بالکوفة نحواً من خمس سنین أکانو ایقنتون؟ قال ای بنُیَّ محدَث۔ (ترمذی، ج۱، باب فی ترک القنوتِ)

''میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ اے ابا جان آپ نے حضور اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے بھی یہاں کوفہ میں تقریباً پانچ سال نماز پڑھی ہے کیا وہ لوگ قنوت پڑھا کرتے تھے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے یہ بدعت ہے''۔ اس حدیث سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ قنوت فی الفجر عام ایام میں نہیں ہوتی تھی، صرف مخصوص ایام میں ہوا کرتی تھی چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: کان رسول الله ﷺ لا یقنت فی صلاة الصبح الا ان یدعو لقوم او یدعو علی قوم (ابن حبان) کہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں صرف اس وقت قنوت پڑھا کرتے تھے جب کسی قوم کے لیے دعا یا بدعا کرنی ہوتی تھی، یہ حدیث صاف بتلا رہی ہے کہ قنوت فی الفجر دائماً مشروع نہیں ہے۔

الکلام فی الصلوٰة

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... کلام اگر نسیاناً ہو یا حکم سے ناواقفیت کی بنا پر ہو تو مفسد صلوٰۃ نہ ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ طویل نہ ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... اگر کلام اصلاح صلاۃ کے لئے ہو تو مفسد نہیں

ہوگا۔اور آپ رحمہ اللہ کی ایک روایت احناف کے مطابق ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے......اس مسئلہ میں چار روایتیں منقول ہیں، تین روایت تو مذاہب ثلاثہ کے مطابق ہیں اور چوتھی روایت یہ ہے کہ اگر مصلی نے یہ سمجھتے ہوئے کلام کیا کہ میری نماز ابھی پوری نہیں ہوئی ہے تو کلام مفسد صلوٰۃ ہوگا۔اور اگر یہ جانتے ہوئے کلام کیا کہ میری نماز پوری ہوچکی ہے،تو پھر کلام مفسد صلوٰۃ نہیں ہوگا خواہ ابھی نماز پوری نہ ہوئی ہو۔

دلیل......ائمہ ثلاثہؒ حضرت ذوالیدینؓ کے واقعہ (ترمذی شریف) سے استدلال کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے چار رکعت والی نماز میں بھول سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو حضرت ذوالیدینؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! نماز میں کمی کردی گئی ہے یا آپ سے بھول ہوگئی ہے؟ اس پر حضور اکرم ﷺ نے دوسرے مقتدیوں سے تصدیق چاہی تو دوسرے حضرات نے بھی کہا کہ ہاں ابھی دو رکعتیں ہی ہوئی ہیں،تو حضور اکرم ﷺ نے دو رکعت اور پڑھا کر چار رکعات پوری فرمادیں۔ملاحظہ فرمائیے کہ اس واقعہ میں حضرت ذوالیدینؓ کی یاددہانی اور آپ ﷺ کا اس پر تصدیق کرنا، پھر لوگوں کا نعم کہنا سب درمیان صلوٰۃ ہوا لیکن نماز فاسد نہیں ہوئی، معلوم ہوا کہ کلام فی الصلاۃ کی گنجائش ہے۔

جواب......احناف کی طرف سے ائمہ ثلاثہ کو اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ واقعہ منسوخ ہے اور اس کے لئے ناسخ وہ احادیث ہیں جن میں کلام فی الصلوٰۃ سے روکا گیا ہے، نیز اس میں بہت زیادہ اضطراب اور تعارض بھی واقع ہے اس لئے یہ واقعہ ہرگز مستدل نہیں بن سکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......کلام فی الصلوٰۃ منسوخ ہوچکا ہے اس لئے مطلقاً مفسد صلوۃ ہے خواہ وہ کسی بھی مقصد سے ہو اور کتنا ہی مختصر ہو۔

دلیل......حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت ہے:قال کنا نتکلم فی الصلوٰۃ یکلم الرجل صاحبہ وھو الیٰ جنبہ فی الصلوٰۃ حتیٰ نزلت وقوموا للہ قانتین ، فامرنا بالسکوت ونھینا عن الکلام. (بخاری:۲/۲۵۰مسلم:۱/۲۰۴) کہ ہم نماز میں بول لیا کرتے تھے، آدمی اپنے ساتھی سے جو کہ نماز میں اس کے پہلو میں ہوتا تھا بول لیا کرتا تھا، یہاں تک کہ

آیت وقوموا للہ قانتین، نازل ہوگئی، پس ہم کو سکوت کا حکم دے دیا گیا اور کلام کرنے سے منع کردیا گیا۔ یہ حدیث کلام فی الصلوۃ کے نسخ پر صراحتاً دلالت کررہی ہے۔ جس کے بعد کسی توضیح کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

سنّة الفجر عند اقامة المکتوبة

فجر کے علاوہ دیگر تمام نمازوں میں ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ جب جماعت کھڑی ہوجائے تو سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہے بلکہ جماعت میں شرکت ضروری ہے، البتہ فجر کی سنتوں میں ائمہ رحمہم اللہ کے اقوال مختلف ہیں۔

امام ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... جب جماعت کھڑی ہوجائے تو فجر کی سنتوں کا پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ جماعت پانے کا یقین ہو۔

دلیل......(۱) اماں جان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ”لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی شئی من النوافل اشدَّ منہ تعاھدًا علی رکعتی الفجر“ (بخاری: ج۱، باب تعاھد رکعتی الفجر، وابوداؤد و مسلم) (۲) ”عن عائشةؓ عن النبی ﷺ قال“ رکعتا الفجر خیر من الدنیا وما فیھا“۔ (مسلم) اماں جان حضرت عائشہ صدیقہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فجر کی دو رکعتیں دنیا اور جو کچھ اس میں ہے ان تمام سے افضل ہیں۔ (۳) نیز اس سے اگلی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو سنتوں کی اہمیت کے بارے میں فرمایا: ”لھما احبّ من الدنیا جمیعاً“ (مسلم) کہ (فجر کی) یہ دو رکعتیں مجھے ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ (۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تدعوھما وان طردتکم الخیل“۔ (ابوداؤد) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان رکعتوں (سنت فجر) کو مت چھوڑو، اگرچہ گھوڑے تم کو روند ڈالیں۔ (۵) متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جماعت کھڑی ہونے کے بعد فجر کی سنتوں کا پڑھنا ثابت ہے۔ (تفصیل طحاوی میں دیکھی جاسکتی ہیں)

امام شافعی و احمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... جماعت کھڑی ہونے کے بعد کسی بھی سنت کا

پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دلیل......حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے:قال رسول اللہ ﷺ اذا اقیمت الصّلوٰۃ فلا صلوٰۃ الّا المکتوبۃ ۔(ترمذی باب اذا اقیمت الصلوٰۃ)رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب جماعت کھڑی ہوجائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔

جواب......حدیث کا عموم، جماعت کھڑی ہونے کے بعد گھر میں (بھی) سنتیں پڑھنے کے عدمِ جواز کا تقاضا کرتا ہے، حالانکہ یہ شوافع رحمہ اللہ کے نزدیک (بھی) جائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ" الّا المکتوبۃ "کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت کھڑی ہونے کے بعد اگر کوئی فوت شدہ قضاء نماز پڑھ رہا ہوتو جائز ہونا چاہئے، حالانکہ شوافع کے ہاں یہ ناجائز ہے۔اب چونکہ شوافع خود بھی حدیث کے عموم پرعمل نہیں کرتے۔گویا ان کے نزدیک یہ حدیث عام مخصوص منہ البعض کے درجے میں ہے۔پس اگر احناف نے تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بناء پر اس میں فجر کی سنتوں کی مزید تخصیص کرلی،تو اس میں کیا حرج ہے۔

صلوٰۃ الوتر واجبۃ

ائمہ ثلاثہؒ وصاحبینؒ کے نزدیک......وتر کی نماز سنت ہے،واجب نہیں ہے۔

دلیل......(۱)حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے:الوتر لیس بحتم کصلوتکم المکتوبۃ ولکن سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی ج:۱،ابواب الوتر) کہ وتر تمہاری فرض نمازوں کی طرح لازم نہیں ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔(۲)اگر وتر واجب ہوتے تو نمازوں کی تعداد چھ ہوتی، حالانکہ نمازوں کی تعداد پانچ بتلائی گئی ہے۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وتر واجب نہیں ہے،سنت ہے۔

جواب......حضرت علیؓ نے وتر کی فرضیت کی نفی فرمائی ہے، وجوب کی نفی نہیں فرمائی ہے جیسا کہ آپؓ کے ارشاد:(وتر تمہاری فرض نمازوں کی طرح لازم نہیں ہے) سے معلوم ہوتا ہے،اور فرضیت کی نفی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نماز وتر کا درجہ فرض نمازوں سے کم ہے،اور فرض سے کم درجہ واجب ہے نہ کہ سنت۔اس لئے حضرت علیؓ کے اثر سے نماز وتر کو سنت ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔اور دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ نماز وتر عشاء کی نماز کے تابع ہے،اور عشاء کے ضمن

میں آتی ہے، اس لئے اس کو علیحدہ سے شمار نہیں کیا گیا۔ اور نمازوں کی تعداد پانچ ہی رہی۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... نماز وتر واجب ہے۔

دلیل...... (۱) حدیث نبوی ﷺ ہے، جس میں تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں: **الوتر حقّ فمن لم یوتر فلیس منا** (ابوداؤد ص ۲۰۱) کہ وتر حق ہے پس جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور حق یہاں واجب کے معنی میں ہے، معلوم ہوا کہ وتر واجب ہے۔ (۲) حدیث پاک ہے: **انّ اللہَ امدکم بصلوٰۃ ھی خیر لکم من حمر النعم** (ترمذی: ۱/۸۵) کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ایک نماز کا اضافہ فرمایا ہے جو کہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، اس حدیث میں اضافہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، حضور اکرم ﷺ کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے، کیونکہ اگر وتر کی نماز سنت ہوتی تو اضافہ کرنے کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف کی جاتی، اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی جاتی۔

رکعات الوتر

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک..... نماز وتر ایک رکعت سے لیکر گیارہ رکعات تک ہے۔ یعنی ایک رکعت، تین رکعات، پانچ رکعات، سات رکعات، نو رکعات اور گیارہ رکعات۔

دلائل مع جوابات...... ایک رکعت کے ثبوت میں حدیث پاک کا ٹکڑا: **الوتر رکعة من آخر اللیل** (مسلم) پیش کی جاتی ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت نماز وتر ادا فرمائی بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ اللیل دو رکعت کر کے پڑھتے تھے، مگر جب نماز وتر کا ارادہ فرماتے تو دو رکعت میں ایک رکعت ملا کر وتر بنالیا کرتے تھے۔ اور تین رکعات والی حدیث، **اوتر بثلٰث** (مسند احمد) کے جواب کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہمارا مسلک بھی یہی ہے۔

البتہ پانچ رکعات والی حدیث، **اوتر بخمس** (ترمذی ج: ۱ باب الوتر بخمس) کا جواب یہ ہے کہ پانچ رکعات وتر کی نہیں تھیں، بلکہ تین رکات وتر کی تھیں اور دو رکعات نفل کی تھیں۔ راوی نے دونوں کو ملا کر بیان کر دیا ہے، اور سات رکعات والی روایت، **اوتر بسبع** (ترمذی

باب الوتر بسبع) کا جواب یہ ہے کہ اس میں تین رکعت وتر کی تھیں اور چار رکعت تہجد کی تھی، کہ آپ ﷺ آخری عمر سے چار رکعت تہجد پڑھا کرتے تھے اور نو رکعت والی حدیث اوتر بتسع ، کا جواب یہ ہے کہ اس میں چھ رکعت تہجد کی تھیں تین وتر کی تھیں یہاں بھی راوی نے ملا کر بیان کر دیا ہے اور گیارہ رکعت والی حدیث، اوتر باحدی عشرة رکعة ، کا جواب یہ ہے کہ اس میں چھ رکعت تہجد کی تھیں اور تین رکعت وتر کی تھیں اور دو رکعت وتر کے بعد والی تھیں جو آپ ﷺ بیٹھ کر ادا فرماتے تھے راوی نے سب کو ملا کر بیان کر دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......وتر کی تین رکعت ہیں، اس سے زائد جائز نہیں ہیں۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: کان رسول اللہ ﷺ یقرأفی الوتر بسبّح اسم ربک الاعلی وقل یا ایھا الکافرون وقل ھو اللہ احد فی رکعة رکعة (ترمذی:۱/۸۶باب ما یقرأ فی الوتر) کہ نبی کریم ﷺ وتر کی نماز میں، سبح اسم ربک الاعلیٰ، قل یاایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد، ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔ اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین سورتیں تین رکعات میں پڑھتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی تین رکعات ہیں نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کان رسول اللہ ﷺ یوتر بثلاث (ترمذی باب الوتر بثلاث) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے۔ یہ حدیث بھی احناف کے مذہب پر صریح ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......بھی وتر کی تین رکعات ہیں، مگر ادائیگی کا طریقہ مختلف ہے جو کہ اگلے باب میں آ رہا ہے۔

القنوت فی الوتر

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......قنوت وتر صرف رمضان میں واجب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......قنوت وتر صرف رمضان المبارک کے نصف اخیر میں مشروع ہے، یہی ایک روایت امام مالک وامام احمد رحمہما اللہ کی بھی ہے۔

دلیل......(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ہے: انہ کان لا یقنت الافی النصف الاخیر من رمضان (ترمذی شریف ص ۸۷ ج ۱) کہ وہ دعائے قنوت صرف رمضان شریف کے نصف اخیر میں پڑھا کرتے تھے۔ نیز حضرت حسن رضی

اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس جمع کیا، چنانچہ وہ ان کو بیس راتیں نماز پڑھاتے تھے، مگر قنوت (رمضان کے) صرف نصف باقی میں پڑھتے تھے۔ (ابوداؤد شریف، مشکوٰۃ شریف ص۱۱۴ ج۱) ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعائے قنوت صرف رمضان میں پڑھی جائے گی۔ دوسرے مہینوں میں نہیں پڑھی جائے گی۔

جواب...... پہلی روایت کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ کا اپنا اجتہاد تھا، یا پھر قنوت سے مراد وہاں قیام طویل ہے، کیونکہ حضرت علیؓ رمضان کے نصف اخیر میں طویل قیام کیا کرتے تھے۔ اور دوسری روایت کا جواب یہ ہے کہ اس میں قنوت سے قنوت وتر مراد نہیں ہے بلکہ قنوت نازلہ مراد ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں: **ان السنة اذا انتصف رمضان ان يلعن الكفرة في الوتر** (مرقاۃ:۳/۱۸۴) کہ جب رمضان آدھا گزر جائے تو یہ سنت ہے کہ وتر میں کفر پر لعنت کی جائے۔ اور لعنت یا بدعا قنوت نازل ہی میں ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ رمضان کے نصف آخر میں قنوت نازلہ ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ حسن بصریؒ نے حضرت عمرؓ کو نہیں پایا ہے۔

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... قنوت وتر پورے سال مشروع ہے۔

دلیل...... حضرت حسن بن علیؓ کی حدیث ہے: **علمني رسول الله ﷺ كلمات اقولهن في الوتر** (ترمذی شریف ج۱) کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ کو کچھ کلمات سکھائے ہیں جن کو میں وتر میں پڑھتا ہوں۔ اس حدیث میں رمضان یا غیر رمضان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعائے قنوت نماز وتر میں پورے سال پڑھی جائے گی نیز دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی پورے سال قنوت وتر کا ثبوت ملتا ہے۔ (مجمع الزوائد:۱/۲۴۴، ابن ابی شیبہ:۲/۳۰۶)

الوتر بسلام واحد

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... نماز وتر دو سلاموں کے ساتھ ہے۔

دلیل...... اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کے پاس کوئی صحیح یا صریح حدیث موجود نہیں ہے، اور نہ ہی یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول رہا ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ وہ دو سلاموں کے قائل تھے، اور اس کو نبی کریم

ﷺ کی جانب منسوب کرتے تھے۔(آثارالسنن ص۱۵۸،معارف السنن ج۴) یہ حضرات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے استدلال کرتے ہیں چنانچہ بخاری میں ہے: کان یسلم بین الرکعۃ والرکعتین فی الوتر الخ (بخاری:۱/۱۳۵) کہ وہ نماز وتر میں ایک رکعت اور دو رکعت کے درمیان سلام پھیرتے تھے۔اور دوسرا سلام آخری رکعت پر پھیرتے تھے،اس طرح دو سلام ہو گئے۔

جواب...... یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا، نیز وہ اپنے اجتہاد میں تنہا تھے، ورنہ جس حدیث (مسلم:۱/۵۷،نسائی:۱/۲۴۷) کا یہ مفہوم سمجھا گیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی اس کے راوی ہیں مگر ان کا عمل ایک سلام سے تین رکعت پڑھنے کا ہے دوسرے یہ کہ اگر وتر دو سلاموں کے ساتھ حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہوتے تو یہ ایک غیر معمولی عمل ہوتا،اور صحابہ کرامؓ اس کو ضرور نقل کرتے، حالانکہ صحابہ کرامؓ اس کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ اس کا برعکس ثابت ہے، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ کان لا یسلم فی رکعتی الوتر۔(نسائی:۱/۲۴۸) کہ نبی کریم ﷺ وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

احناف کے نزدیک...... وتر ایک سلام کے ساتھ ہے۔درمیان میں کوئی سلام نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ اعلم الناس بوتر رسول اللہ ﷺ تھیں، لیکن وہ وتر میں کہیں دو سلاموں کا ذکر نہیں کرتیں، بلکہ بعض احادیث میں ان سے نفی وارد ہوئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: ثم اوتر بثلاث لا یفصل بینھن (آثارالسنن ص۱۶۲) اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے: قالت قال رسول اللہ ﷺ الوتر ثلاث کثلاث المغرب (مجمع الزوائد:۲/۲۴۶) اس کے علاوہ بھی ان سے وتر سے متعلق بے شمار روایات مروی ہیں جن میں، لا یسلم الا فی اخرھن، اور، لا یفصل بینھن، کے الفاظ مذکور ہیں علاوہ ازیں دوسرے اجل صحابہ کرامؓ سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ نماز وتر ایک سلام کے ساتھ پڑھتے تھے۔(طحاوی:۱/۱۴۳،ترمذی ص۸۶ ج۱) ان تمام احادیث وآثار کی روشنی میں حنفیہ کا مذہب پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ نماز وتر ایک سلام کے ساتھ ہے۔

غسل یوم الجمعة

ظاہریہ کے نزدیک...... جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے۔

دلیل......(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذا جـاءَ احـدكـم الـجـمـعة اليغتسل '' (بخاری) کہ تم میں سے جب کوئی شخص جمعہ کی نماز کے لئے آنا چاہے تو اسے غسل کر لینا چاہئے۔ (۲) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال غسل يوم الجمعة واجب علىٰ كلّ محتلم '' (بخاری ومسلم واللفظ للاوّل) کہ جمعہ کے دن ہر بالغ کے لئے غسل ضروری ہے۔

جواب......پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ صیغۂ امر استحباب پر محمول ہے۔ اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور میں ''واجب'' کا صیغہ تاکید کے لئے ہے۔ وہ واجب مراد نہیں جو فقہاء کی اصطلاح میں مشہور ہے اور علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہاں وجوب سے مراد وجوب اختیار واستحباب ہے، وجوبِ فرض مراد نہیں ہے۔ (بذل المجہود ج:۱)

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن (جلد:۱، باب فی الوضوء یوم الجمعۃ) میں امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے کہ وجوب سے مراد وجوبِ استحباب واختیار ہے۔

جمہور ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... جمعہ کے دن غسل کرنا (واجب نہیں بلکہ) سنت ہے۔

دلیل......(۱) حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی حدیث ہے: ''قال ،قال رسول الله ﷺ من تـوضّـا يـوم الـجـمعة فبها ونعمت ومن اغتسل فـالـغـسـل افـضـل '' (ترمذی، ج۱، باب فی الوضوء یوم الجمعۃ، وابوداؤد، ونسائی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے جمعہ کے دن وضو کیا اس نے بہتر کیا، اور جس نے غسل کا تو غسل زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ غسل جموہ واجب نہیں بلکہ سنت ومستحب ہے۔ (۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے: ''قال، قال رسول الله ﷺ مـن تـوضـأ فأحسن الوضوء ثم اتى الجمعة فدنا واستمع وانـصـتَ غـفـر له مابينه وبين الجمعة وزيادة ثلٰثة ايام ومن مسَّ

الطی فقد لغا‘‘(بحوالۂ مذکور)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اچھی طرح وضوء کیا اور پھر جمعہ کے لئے آیا، اور امام کے نزدیک ہوکر بیٹھا، پھر خطبہ سنا، اور (خطبہ کے دوران) خاموش رہا، تو اس جمعہ اور دوسرے جمعہ کے درمیان ہونے والے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور مزید تین دن کے گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں اور جو کنکریوں سے کھیلتا رہا، اس نے لغو کا کام کیا۔

اس حدیث میں غسل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ غسل جمعہ واجب نہیں ہے۔ پھر یہ غسل ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک للصلوٰۃ ہے، چنانچہ اگر نمازِ جمعہ کے بعد غسل کرے گا تو فضیلت کا مستحق نہ ہوگا، اور امام محمد وداؤد ظاہری رحمہما اللہ کے نزدیک یہ غسل للیوم ہے، اس لئے ان کے نزدیک نمازِ جمعہ کے بعد بھی باعث فضیلت ہے۔

وقت الجمعة

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... جمعہ کا وقت ضحوۂ کبریٰ سے شروع ہوجاتا ہے اس لئے ان کے نزدیک جمعہ کی نماز قبل الزوال پڑھنا جائز ہے۔

دلیل...... حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ما کنا نتغدیٰ فی عهد رسول الله ﷺ ولا نقیل الا بعد الجمعة (ترمذی: ۱/۵۹) کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صبح کا کھانا اور قیلولہ جمعہ کے بعد کیا کرتے تھے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ جمعہ کی نماز قبل الزوال پڑھا کرتے تھے، کیسے؟ وہ اس طرح کہ اس میں کہا گیا ہے کہ ہم غداء جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر کھایا کرتے تھے اور غداء کہتے ہیں زوال سے پہلے کے کھانے کو، تو معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز زوال سے بہت پہلے پڑھ لیتے تھے۔

جواب...... یہ ہے کہ اگرچہ لفظ غداء لغت میں زوال سے پہلے کے کھانے کیلئے آتا ہے مگر توسعاً اور عرفاً زوال کے بعد کے کھانے پر بھی بول دیا جاتا ہے، اس لئے اس لفظ (نتغدیٰ) سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔

دلیل...... حدیث پاک: ان النبی ﷺ یصلی الجمعة حین تمتثل الشمس (ترمذی: ۱/۱۱۲) کہ نبی پاک ﷺ جمعہ کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ

سورج ڈھلنے لگتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ زوال شمس کے متصل بعد جمعہ کی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے: کانوا اذا راحوا الی الجمعة راحوا في هيئتهم (بخاری:۱/۱۲۳) اس حدیث میں جمعہ کی نماز کے لئے جانے کو رواح سے تعبیر کیا گیا ہے، اور رواح زوال کے بعد جانے کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ زوال کے بعد ہے نہ کہ زوال سے پہلے۔

الصلوٰة عند الخطبة

خطبہ شروع ہونے کے بعد مسجد میں آنے والے کیلئے دوران خطبہ دوگانہ (تحیة المسجد) پڑھنا کیسا ہے؟

امام شافعی و احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ...... دوران خطبہ مسجد میں آنے والے کیلئے دو گانہ پڑھنا مستحب ہے۔

دلیل...... حضرت سلیک غطفانیؓ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مسجد میں خطبہ کے وقت تشریف لائے، تو حضور اکرم ﷺ نے منبر پر سے ان سے پوچھا کہ تم نے دو رکعت نماز پڑھی؟ انہوں نے کہا نہیں! تو آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اٹھو اور نماز پڑھو۔ (ترمذی:۱/۹۴) نیز حضرت جابرؓ عنہ کی روایت ہے: قال رسول الله ﷺ وهو يخطب اذا جاء احدكم والامام يخطب اوقد خرج ليصل ركعتين (بخاری:۱/۱۵۶) نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایسے وقت مسجد میں آئے جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو یا خطبہ دینے کیلئے نکل گیا ہو تو تم کو چاہئے کہ (پہلے) دو رکعت نماز ادا کرلو۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نو وارد کیلئے دوران خطبہ تحیة المسجد پڑھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔

جواب...... پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ (۱) حضرت سلیکؓ دوران خطبہ مسجد میں تشریف نہیں لائے تھے، بلکہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے مسجد میں آئے تھے جبکہ حضور اکرم ﷺ صرف منبر پر بیٹھے ہوئے تھے ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع نہیں فرمایا تھا (مسلم:۱/۲۸۷)۔ (۲) آپ ﷺ نے ان کو تحیة المسجد کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ سنن قبلیہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ (۳) یہ ایک جزئی واقعہ ہے، جس سے قاعدہ کلیہ اور عمومی حکم مستنبط نہیں کیا

جا سکتا۔اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث چونکہ آیت کریمہ **و اذا قرئ القرآن فاستمعوا اله و انصتوا** (مجمع الزوائد ص۱۸۴ ج۲) اور بہت سی ان احادیث کے معارض ہے۔ جن میں خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنے اور کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لئے تطبیق یا ترجیح کی ضرورت ہے۔پس تطبیق کی صورت تو یہ ہے کہ **والا مام یخطب**، کے معنی، **کاد الامام ان یخطب**، لئے جائیں اور اگر ترجیح کی صورت اختیار کی جائے تو بہر حال مبیح کے مقابلہ میں محرّم راجح ہوتا ہے،اس لئے روایات نہی کو ترجیح حاصل ہوگی۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ.....دوران خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دلیل......پہلی دلیل آیت کریمہ مذکورہ(**و اذا قرئ القرآن**)ہے،جس کے عموم میں خطبہ بھی داخل ہے، بلکہ شوافع تو اس آیت کو خطبۂ جمعہ کے ساتھ ہی مخصوص مانتے ہیں۔نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: **قال رسول الله** ﷺ **من قال یوم الجمعة و الامام یخطب، انصت فقدلغا** (ترمذی:۱/۹۴) ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں دوران خطبہ امر بالمعروف سے منع کیا گیا ہے جو فرض ہے،تو تحیۃ المسجد جو کہ صرف مستحب ہے بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگی۔

من ادرک من الجمعة رکعةً

ائمہ ثلاثہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک......اگر کوئی شخص نماز جمعہ کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد شریک ہو تو اس پر ظہر کی نماز واجب ہو جائے گی۔اور وہ جمعہ کو پانے والا نہیں کہلائے گا۔

دلیل......حدیث نبوی ہے: **من ادرک من الصلوٰة رکعة فقد ادرک الصلاة** (ترمذی) کہ جس شخص نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے پوری نماز پالی۔یہ حضرات اس حدیث کے مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں کہ جس نے ایک رکعت بھی نہیں پائی اس نے نماز ہی نہیں پائی۔نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: **من ادرک من الجمعة رکعة فلیصل الیها اخریٰ و من فاته الرکعتان فلیصل اربعا** (دارقطنی) کہ جس شخص نے جمعہ کی ایک رکعت پالی اس کو چاہئے کہ دوسری رکعت بھی پڑھ لے اور جس کی دونوں رکعتیں چھوٹ جائیں تو وہ ظہر کی چار رکعت ادا کرے۔

جواب......پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے۔

اس لئے مفہوم مخالف سے حکم کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری حدیث میں رکعتان کے فوت ہونے سے پوری نماز کا فوت ہونا مراد ہے۔ یہ نہیں کہ دوسری رکعت کا رکوع چھوٹ گیا تو ظہر کی نماز ادا کرے۔ بلکہ دوسری رکعت پوری فوت ہوجائے مع سلام کے تب یہ حکم ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اگر کوئی شخص جمعہ کی نماز میں سلام سے پہلے شریک ہوگیا تو وہ جمعہ کو پانے والا کہلائے گا، یہی مسلک امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ہے۔

دلیل...... حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: اذا اتیتم الصلوٰۃ فعلیکم السکینۃ فما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتمّوا (بخاری شریف ص۸۸ ج۱) کہ جب تم نماز کیلئے آؤ تو تم پر سکون لازم ہے پس جتنی نماز پالو اس کو پڑھ لو اور جو تم سے چھوٹ جائے اس کو پورا کرلو۔ اس حدیث میں عموم ہے کہ نماز پوری ہونے سے پہلے پہلے جو چھوٹ جائے اس کو پورا کرلو، پس اگر تشہد بھی مل جائے گا تو نماز کا پانے والا کہلائے گا۔ بلکہ سلام سے پہلے بھی اگر شریک ہوگیا تو نماز مل جائے گی۔ نیز اس میں جمعہ وغیر جمعہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس لئے جمعہ بھی اس میں شامل ہوگا۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: من ادرک التشھد فقد ادرک الصلوٰۃ (ابن ابی شیبہ) کہ جس نے تشہد پالیا اس نے نماز پالی۔ اور حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں: اذا دخل فی صلاۃ الجمعۃ قبل التسلیم وھو جالس فقد ادرک الجمعۃ، ان تمام روایات وآثار کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ نماز پانے کیلئے آخری رکوع کو پانا ضروری نہیں بلکہ اگر اس کے بعد بھی (سلام سے پہلے) شریک ہوگیا تو جمعہ مل جائے گا۔

القصر عزیمۃ ام رخصۃ؟

حالت سفر میں قصر کرنا عزیمت (واجب) ہے یا رخصت (جائز) ہے؟

امام شافعیؒ کے نزدیک...... بعض صورتوں میں قصر اور بعض صورتوں میں اہتمام افضل ہے۔

امام مالک واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... اتمام اور قصر دونوں جائز ہیں۔

دلیل...... ائمہ ثلاثہؒ آیت کریمہ: واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ سے استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو اس آیت میں، لیس علیکم جناح (کہ تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا) کے الفاظ سے

قصر کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور یہ الفاظ فعل مباح کیلئے آتے ہیں۔ وجوب کیلئے نہیں آتے۔ معلوم ہوا کہ قصر کرنا صرف جائز اور مباح ہے۔ نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: **ان النبی ﷺ کان یقصر فی السفر و یتم ویفطر ویصوم** (دارقطنی) کہ نبی کریم ﷺ سفر میں قصر بھی فرماتے تھے اتمام بھی، افطار بھی کرتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصر واجب نہیں ہے صرف جائز ہے ورنہ حضور اکرم ﷺ ہمیشہ قصر ہی فرماتے اتمام کبھی نہ کرتے۔

جواب......**لیس علیکم جناح** کی بابت یہ کہنا کہ یہ الفاظ وجوب کیلئے نہیں آتے صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ وجوب کیلئے بھی استعمال ہوتے ہیں، چنانچہ صفا و مروہ پر سعی سے متعلق ارشاد باری ہے: **فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیه ان یطّوّف بهما** ، ملاحظہ فرمایئے اس آیت میں **لا جناح علیه** ، بالاتفاق وجوب کیلئے ہے۔ اور حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جواب علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ یہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر کے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا ہے (نسائی:۱/۲۱۲) نیز حدیث کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے سفر میں جو کہ تین مراحل سے کم ہوتا اتمام فرماتے تھے اور لمبے سفر میں قصر فرماتے تھے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......سفر میں قصر واجب ہے، اتمام جائز نہیں ہے۔

دلیل......حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: **فرض اللہ الصلوٰۃ علیٰ لسان نبیکم فی الحضر اربعا وفی السفر رکعتین** ۔ (مسلم:۱/۲۴۱) کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبانی نماز فرض فرمائی ہے حضر میں چار رکعات اور سفر کی حالت میں دو رکعات۔ نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: **الصلوٰۃ اول مافرضت رکعتین فأُقرّت صلوٰۃ السفر واتمّت صلوٰۃ الحضر** (مسلم:۱/۲۴۱) کہ شروع میں نماز دو رکعت فرض ہوئی تھی، چنانچہ سفر میں وہی باقی رکھی گئی اور حضر میں بڑھادی گئی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی دو رکعات تخفیف کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ اصلاً اتنی ہی فرض ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ عزیمت ہیں رخصت نہیں ہیں۔

صلوٰۃ الکسوف

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......صلوٰۃ الکسوف عام نمازوں کی طرح ہے، ہر رکعت میں ایک رکوع ہے۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''قال انکسفت الشمس علیٰ عهد رسول الله ﷺ فقام لم یکد یر کع، ثم رکع، فلم یکد یرفع ثم رفع، فلم یکد یسجد ثم سجد، فلم یکد یرفع، ثم رفع ا ھ'' (ابوداؤد، نسائی، شمائل ترمذی) کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں سورج گرہن ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کھڑے ہوئے، تو لگتا نہیں تھا کہ رکوع کریں گے، اس کے بعد رکوع کیا، تو لگتا نہیں تھا کہ (رکوع سے) سر اٹھائیں گے، اس کے بعد سر اٹھایا، تو لگتا نہیں تھا کہ سجدہ کریں گے، پھر سجدہ کیا، تو لگتا نہیں تھا کہ سجدہ سے سر اُٹھائیں گے، پھر سر اُٹھایا۔

اس حدیث میں دو رکوع کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ صلوٰۃ کسوف کوئی الگ نماز نہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح اس کی بھی ہر رکعت ایک ہی رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۲) حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالیؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے صلوٰۃ کسوف پڑھنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ (سورج، چاند) اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، اللہ تعالیٰ (ان کے ذریعے) بندوں کو ڈراتے ہیں۔ پس جب تم لوگ ایسا (سورج یا چاند گرہن) دیکھو تو اس نماز جیسی نماز پڑھو، جو ابھی ابھی تم نے فرض نماز (فجر) پڑھی۔ (ابوداؤد و نسائی)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے صراحۃً حکم فرمادیا کہ اس نماز کو فجر کی نماز کی طرح پڑھا کرو، سو اگر ایک سے زیادہ رکوع جزوِ صلوٰۃ ہوتے، تو آپ ﷺ یہ حکم نہ فرماتے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......صلوٰۃ کسوف کی ہر رکعت میں دو رکوع ہیں۔

دلیل......حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: ''انہ ﷺ صلی اربع رکعات فی رکعتین، واربع سجداتٍ (مسلم) کہ نبی کریم ﷺ نے دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار سجدے کئے۔

جواب......آپ ﷺ سے بلاشبہ دو رکوع ثابت ہیں۔ بعض روایات میں دو سے زیادہ رکوع کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ تاہم یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی۔ یہ رکوع جزِ صلوٰۃ نہیں تھے،

بلکہ رکوعات تخشع تھے۔اس لئے کہ اس نماز (کسوف) میں آپ ﷺ کو جنت اور جہنم کے نظارے دکھائے گئے تھے۔

وجوہِ ترجیح مذہب امام اعظم رحمہ اللہ...... (۱) تعدادرکوع کی تمام روایات فعلی ہیں جبکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مستدلات (ایک رکوع والی روایات) قولی بھی ہیں اور فعلی بھی۔(۲) امام اعظم رحمہ اللہ کے مستدلات عام نمازوں کے اُصول کے مطابق ہیں۔(۳) امام اعظم رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے سے تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے قول پر عمل کرنے سے بعض روایات کو چھوڑنا لازم آتا ہے۔

حکم سجود القراٰن

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... سجدۂ تلاوت واجب ہے۔

دلیل...... آیتِ سجدہ تین قسم کی ہیں یا ان میں سجدہ کا حکم ہے جیسے: ''فاسجدو الله واعبدوا'' (سورۃ النجم) یا کفار کے سجدہ سے انکار کا ذکر ہے جیسے: ''واذا قرئ علیهم القراٰن لایسجدون''۔(سورۃ الانشقاق) یا انبیاء علیہم الالسلام کے سجدہ کی حکایت ہے جیسے: ''فاستغفر ربّه وخرّ راكعاً واناب''۔(سورۃ ص) اور یہ تینوں باتیں (امر کی تعمیل، کفار کی مخالفت اور انبیاء علیہم السلام کی اقتداء) واجب ہیں، جب تک اس کے عدم لزوم پر دلیل نہ ہو۔(فتح القدیر باب سجود التلاوۃ) (۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: ''قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قرأ ابن ادم السّجدة فسجد اعتزل الشيطٰن يبكى يقول يا ويلى أُمر ابن اٰم بالسجود فسجد فله الجنّة واُمرت بالسجود فاَبيتُ فلى النّار'' (مسلم کتاب الایمان باب اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ) کہ جب ابن آدم سجدہ والی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے، تو شیطان روتا ہوا اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس! ابن آدم کو سجدہ کا حکم کیا گیا تو سجدہ کر کے جنت کا مستحق بن گیا اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے (سجدہ سے) انکار کیا پس میں جہنمی ہو گیا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... سجدۂ تلاوت سنت ہے۔

دلیل......(۱) حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث ہے: "قال قرأت علیٰ رسول اللہ ﷺ النجم فلم یسجد فیہا" (بخاری، مسلم، ترمذی) حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سورۃ النجم کی تلاوت کی تو آپ ﷺ نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔

جواب...... حدیث میں سجود علی الفور کی نفی ہے اور ہمارے نزدیک بھی علی الفور نہیں بلکہ علی التراخی واجب ہے۔

دلیل......(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے جمعہ کے دن منبر پر سورۂ نحل پڑھی، جب سجدہ کی آیت (کے آخر) تک پہنچے، تو منبر سے اُترے اور سجدہ کیا، لوگوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ کیا۔ دوسرے جمعہ کو پھر یہی سورۃ پڑھی۔ جب سجدہ کی آیت پر پہنچے تو فرمانے لگے لوگو! ہم سجدہ کی آیت پڑھتے چلے جاتے ہیں، پھر جو کوئی سجدہ کرے، اس نے اچھا کیا اور جو کوئی نہ کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔

جواب...... اس حدیث سے بھی علی الفور کی نفی مراد ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ہم پر اجتماعی صورت میں واجب نہیں ہے۔

خروج النساء الی المساجد

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......عورتوں کا مسجد میں نماز کے لئے جانا جائز ہے۔ (عینی ص ۲۲۸ ج ۳) اور عیدین میں بوڑھی عورتوں کا جانا مستحب ہے۔ (معارف السنن ص ۴۴۶ ج ۴)

امام احمدؒ کے نزدیک......عورتوں کا صرف عیدین میں شرکت کرنا جائز ہے۔ (بحوالہ مذکورہ)

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......جوان عورتوں کا پنج وقتہ نمازوں یا عیدین میں شریک ہونا جائز نہیں ہے۔ البتہ بوڑھی عورتوں کے لئے عیدین میں جانا جائز ہے۔

صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک......جوان عورتوں کا پنج وقتہ نمازوں میں شرکت کرنا جائز ہے۔

دلیل...... جو حضرات عورتوں کے لئے خروج الی المساجد کو جائز کہتے ہیں وہ حضرت ام عطیہؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ فرماتی ہیں: ان رسول اللہ ﷺ کان یخرج الابکار والعواتق وذوات الخدور

والحیض فی العیدین الخ (معارف السنن:۴/۴۴۷) اس حدیث سے عورتوں کا عیدین میں شرکت کرنا معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے:اذا استأذنتْ امرأة احدکم الی المسجد فلا یمنعنّها (بخاری) کہ اگر تم میں سے کسی کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو اس کو ہرگز مت روکو۔اس حدیث سے عورتوں کا مساجد میں جانا ثابت ہوتا ہے اسی طرح ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے:لا تمنعوا اماء الله مساجد الله. (ابو داؤد) کہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھر جانے سے منع مت کرو۔غرضیکہ ان تمام احادیث سے عورتوں کیلئے خروج الی المساجد کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

جواب……(۱) جن احادیث سے عورتوں کے مسجد میں جانے کا جواز معلوم ہوتا ہے، وہ اس زمانے سے متعلق ہیں جب کہ عورتوں کو اس کی اجازت تھی۔بعد میں فتنہ کے خوف سے ان کو روک دیا گیا تھا اور اب تو فتنہ کا مزید اندیشہ ہے اس لئے متاخرین نے عدم خروج پر اجماع کیا ہے۔(۲) یہ تمام احادیث عجائز پر محمول ہیں۔یعنی صرف بوڑھی عورتوں کیلئے اجازت ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک……شابّہ (جوان) عورت کیلئے عیدین یا مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے جانا جائز نہیں ہے۔البتہ بوڑھی عورتوں کیلئے صرف فجر۔مغرب اور عشاء میں مسجد جانے کی اجازت ہے۔مگر ان کیلئے بھی افضل یہی ہے کہ وہ گھر میں نماز پڑھیں۔

دلیل……حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے:وبیوتهن خیر لهن (ابوداؤد) کہ ان کے لئے ان کے گھر ہی بہتر ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے: قال صلوٰة المرأة فی بیتها افضل من صلاتها فی حجرتها وصلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بیتها (ابوداؤد) نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کے بارے میں فرماتی ہیں:لو ادرک رسول الله ﷺ ما احدث النساء لمنعهن کما منعت نساء بنی اسرائیل (بخاری ومسلم ومعارف السنن:۴/۴۴۶) کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان چیزوں کو دیکھ لیتے جو عورتوں نے نکالی ہیں تو ان کو بالضرور منع فرمادیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کیلئے مسجد میں جانا فتنہ کا سبب بن سکتا ہے۔اس لئے جائز نہیں ہے۔

اعادة الصلوٰة بعد الاداء

کیا ایک مرتبہ نماز پڑھنے کے بعد وہی نماز دوبارہ جماعت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......اعادہ صلوٰۃ بالجماعۃ مطلقاً جائز ہے۔

دلیل......حضرت یزید بن الاسودؓ کی حدیث ہے: **ان رسول الله ﷺ قال اذا صلى احدكم في رحله ثم ادرك الامام ولم يصل فليصل معه فانها له نافلة** (ابوداؤد) کہ جب تم میں سے کوئی اپنی قیام گاہ میں نماز پڑھے پھر امام کو پالے اور ابھی اس نے نماز پوری نہیں کی ہے تو اس کے ساتھ بھی پڑھ لے اس لئے کہ وہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔ نیز حضرت جابرؓ کی روایت: **ان معاذاً يصلي مع النبي ﷺ ثم يأتي قومه فيصلّ بهم** (شیخین) کہ حضرت معاذؓ حضور اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھ لیتے تھے پھر اپنی قوم میں آتے تھے اور ان کو بھی نماز پڑھاتے تھے۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز پڑھنے کے بعد اگر کہیں جماعت ہو رہی ہو تو اس میں بھی بہ نیت نفل شریک ہو سکتے ہیں۔

جواب......حضرت یزیدؓ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث صحیحہ کے معارض ہے اس لئے مبیح کے مقابلے میں محرّم کو ترجیح حاصل ہوگی۔ دوسرے یہ کہ حدیث یزیدؓ میں متناً اضطراب ہے اس وجہ سے بھی وہ قابل استدلال نہیں ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث نہی سے قبل کا واقعہ ہے، اس لئے مرجوح ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک......اگر پہلی مرتبہ اس نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی ہے، تو دوبارہ اس کو نہیں پڑھ سکتا، اور اگر بغیر جماعت کے ادا کی ہے تو مغرب کے علاوہ بقیہ نمازوں کو دوبارہ پڑھ سکتا ہے۔

دلیل......یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا وہ کامل ادا ہو گئی اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی ہے، تو جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے اعادہ کر سکتا ہے۔ البتہ مغرب کے اعادہ سے چونکہ منع کیا گیا ہے اس لئے مغرب کا اعادہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: **ان ابن عمرؓ كان يقول من صلى المغرب او الصبح ثم ادركها مع الامام فلا يعدلهما** (موطا مالکؒ)

نیز انہی سے مروی ہے: ان النبی ﷺ قال اذا صلیت فی اھلک ثم ادرکت فصلھا الا الفجر والمغرب (دارقطنی) ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز مغرب کا اعادہ کسی حال میں بھی درست نہیں ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ مغرب کے علاوہ بقیہ نمازوں کا اعادہ کسی حال میں بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ دوسری مرتبہ جب اس نماز کو پڑھے گا تو وہ نفل ہوگی حالانکہ فجر اور عصر کے بعد تو کوئی نفل نماز ہے ہی نہیں۔ اس لئے صرف مغرب کا استثناء کر کے **علی الاطلاق** اعادہ کی اجازت دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... فجر، عصر اور مغرب کا اعادہ نہیں کرسکتا، البتہ ظہر وعشاء کا اعادہ کرسکتا ہے۔

دلیل...... فجر اور عصر کے استثنٰی کی دلیل حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ''ان النبّی ﷺ قال لا صلوٰۃ بعد الصبح حتی ترتفع الشمس ولا صلوٰۃ بعد العصر حتّٰی تغیب الشمس '' (شیخین) کہ فجر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے، جب تک کہ سورج بلند نہ ہوجائے اور عصر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے، جب تک کہ سورج غروب نہ ہوجائے۔ اسی حدیث کی وجہ سے فجر اور عصر کو مستثنٰی کیا گیا ہے۔ اور مغرب کی نماز کا استثناء امام مالکؒ کے دلائل میں مذکور حضرت ابن عمرؓ والی حدیث سے کیا گیا ہے۔

نیز مغرب کی تین رکعات ہوتی ہیں، اور تین رکعات نفل مشروع نہیں ہیں اور اگر ایک ملا کر چار کیا جائے تو امام کی مخالفت لازم آئے گی۔

صلوٰۃ الجنازۃ علی القبر

اگر میت کو بغیر نماز جنازہ پڑھے ہوئے دفن کردیا گیا تو اس صورت میں تمام **ائمہ رحمہم اللہ** اس بات پر متفق ہیں کہ جب تک میت کے اجزاء متفرق نہ ہوں قبر پر نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر نماز جنازہ پڑھ کر میت کو دفن کیا گیا ہے تو قبر پر دوبارہ سہ بارہ نماز پڑھنے میں اختلاف ہے۔

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... قبر پر دوبارہ سہ بارہ نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔

دلیل...... (۱) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: ان امرأۃ سوداء کانت تقم المسجد ففقدھا النبی ﷺ وسأل عنھا فقالو ا ماتت قال افلا کنتم

آذنتمونی؟! (شیخین) یعنی ایک کالی عورت مسجد میں جھاڑو دیتی تھی، حضور اکرم ﷺ نے اس کو نہیں دیکھا تو اس کے بارے میں دریافت کیا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ وہ تو مر چکی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو خبر کیوں نہیں کی۔ حدیث میں آتا ہے: فصلّٰی علی قبرھا ، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (۲) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ رأی قبراً منتبذاً فصف اصحابه فصلی علیه (ترمذی) کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک قبر جو کہ (ساری قبروں سے دور) ایک طرف تھی دیکھی، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صف بنوائی اور پھر نماز جنازہ پڑھی۔ (۳) حضرت ابن عمرؓ سے اپنے بھائی حضرت عاصمؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کی قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ (بیہقی:۴/۴۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوۃ الجنازۃ علی القبر جائز ہے۔

جواب...... جن احادیث میں حضور اکرم ﷺ کا کسی قبر پر نماز جنازہ پڑھنا مذکور ہے، تو یہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت تھی۔ کیونکہ آپ ﷺ کے نماز جنازہ پڑھنے سے قبر پر نور ہو جاتی تھی چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ قال ان هذه القبور مملوۃ ظلمة علی اهلها وان الله ینورها لهم بصلوتی علیهم (مسلم) کہ یہ قبریں تاریکی سے بھری ہوتی ہیں پھر میرے ان پر نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ ان کو منور کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضور اکرم ﷺ ساری امت کے ولی ہیں اور ولی کو اعادۂ صلاۃ کی اجازت ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ و حضرت عائشہؓ کی احادیث کا جواب یہ ہے کہ وہاں صلاۃ سے نماز جنازہ مراد نہیں ہے بلکہ دعاء خیر مراد ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، بذل:۴/۲۰۴، اوجز المسالک:۴/۴۴۹، والعینی:۴/۲۹)

امام اعظم و امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... اگر میت کو نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا ہے۔ تو دوبارہ قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... ہمارا سب سے بڑا مستدل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا بے شمار قبروں پر گزر ہوا مگر کہیں بھی ان سے اعادۂ صلاۃ ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نافعؒ حضرت ابن عمرؓ کا عمل نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: انه کانه اذا انتهی الی جنازۃ قد

صلی علیه دعا وانصرف ولم یعد الصلاة (الجوہرالنقی:۴/۴۸) کہ وہ جب کسی جنازہ میں جاتے نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہوتی تو دعا کر کے واپس ہو جاتے، نماز کا اعادہ نہیں فرماتے تھے، ملاحظہ فرمائیے کہ دوبارہ نماز جنازہ کی صاف صاف نفی فرمارہے ہیں۔ اور جہاں تک حضور اکرم ﷺ کے دوبارہ قبر پر نماز پڑھنے کا سوال ہے تو وہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

القیام للجنازۃ

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا واجب ہے۔

دلیل...... حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: **ان النبی ﷺ قال اذا رأیتم الجنازۃ فقوموا فمن تبعها فلا یقعد حتی توضع** (شیخین) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ، پھر جو اس کے پیچھے چلے وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ جنازہ زمین پر نہ رکھ دیا جائے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہونے کا حکم نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت جابرؓ سے مروی ہے: **ان النبی ﷺ قال اذا رأیتم الجنازۃ فقوموا**، نیز حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: **قال مر علی النبی ﷺ بجنازۃ فقام وقال قوموا**، الخ (ابن ماجہ) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور (دوسروں کو بھی) حکم فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنازہ دیکھ کر کھڑا ہو جانا چاہئے۔

جواب...... جمہور کی جانب سے مذکورہ تمام احادیث کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایسی تمام احادیث جن میں "**قیام للجنازۃ**" مذکور ہے منسوخ ہیں اور ناسخ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو کہ نیچے آرہی ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ وصاحبینؒ کے نزدیک...... جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت علیؓ کی حدیث ہے: **ان النبی ﷺ کان یقوم فی الجنازۃ ثم جلس بعد** (مسلم) اور ایک دوسری جگہ اس طرح وارد ہوا ہے۔ **کان النبی ﷺ یا مرنا بالقیام فی الجنازۃ ثم جلس بعد ذلک**

وامر بالجلوس (صحیح ابن حبان) کہ حضور اکرم ﷺ پہلے جنازہ کے بارے میں کھڑے ہونے کا حکم فرماتے تھے، پھر آپ ﷺ بیٹھنے لگے اور ہم کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ''قیام للجنازۃ'' ابتدائی دور میں تھا پھر بعد میں منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا اب اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ الابل

(بنت مخاض ایک سالہ..... بنت لبون دو سالہ..... حقہ تین سالہ..... جذعہ چار سالہ اونٹنی کو کہتے ہیں)

اونٹوں کی زکوٰۃ سے متعلق ایک سو بیس تک جو تفصیل ہے اس میں تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ متفق ہیں، اور کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ایک سو بیس کے بعد اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک..... ایک سو بیس کے بعد استیناف نہیں ہوتا، بلکہ ہر چالیس پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ واجب ہوتا ہے۔

امام مالک واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک..... بھی ایک سو بیس سے اوپر استیناف نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق ہر چالیس پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ واجب ہوتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ امام شافعیؒ اس حساب کو ایک سو اکیس سے جاری کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات ایک سو تیس سے جاری کرتے ہیں۔

دلیل..... حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے: **قال فاذا زادت علی عشرین ومائۃ ففی کل خمسین حقۃ وفی کل اربعین ابنۃ لبون** (ترمذی) کہ اگر اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو ہر پچاس پر ایک حقہ ہے اور ہر چالیس پر ایک بنت لبون ہے۔ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ائمہ ثلاثہؒ فرماتے ہیں کہ ایک سو بیس سے اوپر صرف چالیس اور پچاس والا حساب چلے گا۔ پانچ اونٹ پر ایک بکری اور پچیس پر ایک بنت مخاض والا حساب نہیں چلے گا۔

امام اعظمؒ کے نزدیک..... ایک سو بیس سے اوپر استیناف ہوگا یعنی وہی حساب چلے گا، جو شروع میں چلتا ہے کہ ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری اور ہر پچیس پر ایک بنت مخاض واجب ہوگی۔

دلیل..... حضرت عمرو بن حزمؓ کو حضور اکرم ﷺ نے ایک صحیفہ لکھوا کر دیا تھا۔ اس میں اونٹوں کی زکوٰۃ سے متعلق یہ ارشاد مرقوم تھا: **انہا اذا بلغت**

تسعین ففیها حقتان الی ان تبلغ عشرین ومائة فاذا كانت اكثر من ذلک ففی کل خمسین حقة فما فضل فانه یعاد الی اول فریضة الا بـــل (نسائی ومراسیل ابوداؤد) کہ جب تعداد نوے تک پہنچ جائے تو اس میں دو حقے ہیں ایک سوبیس تک۔ پھر جب اس سے اوپر ہو جائے تو ہر پچاس پر ایک حقہ ہے اور جو باقی بچے اس کو فریضہ اولیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یعنی جو باقی بچے گا اس میں وہی حساب جاری ہوگا جو فریضۂ اولیٰ (پانچ سے لیکر ایک سوبیس تک) میں جاری ہوا تھا۔ اور فریضۂ اولیٰ میں پانچ اونٹ پر ایک بکری اور پچیس پر ایک بنت مخاض واجب ہوتی تھی۔ پس ثابت ہوگیا کہ ایک سوبیس سے اوپر بھی ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری اور ہر پچیس پر ایک بنت مخاض واجب ہوگی۔ نیز ہم نے جو ایک سوبیس سے اوپر حساب جاری کیا ہے، اس میں ان کی حدیث پر بھی عمل ہو جاتا ہے کہ ہر پچاس پر ایک حقہ اور ہر چالیس پر ایک بنت لبون واجب ہوتی ہے اس لئے ان کی حدیث کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

نقشہ زکوٰۃ الابل

تعدادِ ابل	مقررہ زکوٰۃ	تعدادِ ابل	مقررہ زکوٰۃ
۵	ایک بکری	۳۶	بنت لبون
۱۰	۲ بکریاں	۴۶	حِقّہ
۱۵	۳ بکریاں	۶۱	جذعہ
۲۰	۴ بکریاں	۷۶	۲ بنت لبون
۲۵	بنت مخاض	۹۱ تا ۱۲۰	۲ حِقّے

اس کے بعد استیناف ہوگا

۱۲۵ ابل.........ایک بکری، ۲ حِقّے......الخ۔

صدقة الزرع والثمر

زمین کی پیداوار کھیتی، پھل اور سبزیوں میں وجوب عشر کے لئے نصاب مقرر ہے یا نہیں؟

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......کھیتی، پھل اور سبزیوں میں وجوب عشر کے لئے کوئی

نصاب مقرر نہیں۔ پیداوار قلیل ہو یا کثیر اس میں عشر (دسواں حصہ نکالنا) واجب ہے۔

دلیل...... (۱) آیت کریمہ ہے: "واٰتوا حقہ یوم حصادہ"۔ (سورۃ الانعام) آیت کریمہ میں حق سے مراد عشر ہے اور مطلق ذکر کیا گیا ہے۔ نصاب کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ (۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "فیما سقت السَّماء والعیون او عَثریاً العشر وما سقی بالنّضح نصف العشر" (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی) کہ وہ زمین جسے آسمان (بارش کا پانی) یا چشمہ سیراب کرتا ہو۔ یا وہ خود بخود نمی سے سیراب ہو جاتی ہو تو اس کی پیداوار سے دسواں حصہ لیا جائے اور وہ زمین جسے کنویں سے پانی کھینچ کر سیراب کیا جاتا ہو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائے۔ قرآن و حدیث کی مذکورہ نصوص سے معلوم ہوا کہ عشر کے وجوب کے لئے نصاب کی کوئی تحدید و تعیین نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ و صاحبینؒ کے نزدیک...... زمین کی پیداوار میں عشر کے وجوب کے لئے نصاب مقرر ہے جو کہ پانچ وسق کی مقدار ہے (یعنی پانچ وسق سے کم کی مقدار پر عشر واجب نہیں ہے)۔

دلیل...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس فی مادون خمسة اوسق صدقة"۔ (بخاری، ترمذی، نسائی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

جواب...... (۱) حدیث مصدّق سے متعلق ہے یعنی پانچ وسق سے کم کا صدقہ عاشر نہیں لے گا۔ (۲) علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث عرایا پر محمول ہے۔ یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی غریب کو کھجور کا کوئی درخت (اس کا پھل) دیدیا پھر اس درخت پر لگے پھل کے عوض پانچ وسق کھجور اس غریب کو دیدے تو اب اس درخت کے پھل میں پانچ وسق کی مقدار تک عشر واجب نہ ہوگا۔

صدقة الخيل

تجارت کے گھوڑوں میں بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہے اور سواری کے گھوڑوں میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ تناسل (نسل بڑھانے) والے، سائمہ (چرنے والے)

گھوڑوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......تناسل والے سائمہ گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔

دلیل...... مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل مرفوع حدیث ہے جس میں ہے: "**لم ينس حق الله في ظهورها ولا رقابها**" "ظہور سے مراد ہے "کسی کو عاریت پر دینا" اور "حق فی الرقاب" سے مراد زکوٰۃ۔

ائمہ ثلاثہ وصاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک......تناسل والے سائمہ گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

دلیل......حضرت علیؓ کی مرفوع روایت ہے: "**قال رسول الله ﷺ قد عفوت عن صدقة الخيل والرقيق ا ھ۔**" (ترمذی باب زکوٰۃ الذہب والورق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کردی۔ (۲) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: "**قال قال النبي ﷺ ليس على المسلم في فرسه وغلامه صدقة۔**" (بخاری، مسلم، ترمذی وابوداؤد) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جواب...... مذکورہ دونوں حدیثوں میں سواری، خدمت اور جہاد کے گھوڑے مراد ہیں اور اس پر قرینہ "**وغلامه**" کا عطف ہے اور غلام سے بالاتفاق خدمت کا غلام مراد ہے۔ اور ایسے گھوڑوں میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے۔

الزكوٰة في المال المستفاد

اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو، مگر اس پر ابھی سال نہ گزرا ہو کہ درمیان میں کچھ اور مال حاصل ہو جائے تو یہ دوسرا مال، مال مستفاد کہلاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ اس پر الگ سے سال شمار کیا جائے گا یا اس کو مال سابق کے ساتھ ضم کر دیا جائے گا؟ تو اس کی تین صورتیں ہیں۔ (۱) پہلی صورت یہ ہے کہ مال مستفاد مال سابق کی جنس سے نہ ہو (جیسے مال سابق سونا چاندی ہو اور مال مستفاد بکریاں ہوں) تو اس کا حکم بالاتفاق یہ ہے کہ مال مستفاد کو مال سابق سے علیحدہ رکھا جائے گا،، مال سابق میں ضم نہیں کیا جائے گا۔ اور دونوں پر الگ الگ سال شمار کیا جائے گا۔ (۲) دوسری صورت یہ

ہے کہ مال مستفاد مال سابق کی جنس سے ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ مال سابق کے ذریعے ہی حاصل ہوا ہو (مثلاً مالِ سابق بکریاں تھیں۔اب درمیانِ سال میں بچے ہو گئے یا مالِ تجارت تھا، اب اس کا نفع آ گیا) تو اس صورت میں بالاتفاق دونوں کو ضم کر دیا جائے گا۔ اور مال مستفاد کی زکوٰۃ مال سابق کے ساتھ ادا کی جائے گی۔ (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ مال مستفاد مال سابق کی جنس سے تو ہے مگر مال سابق کے ذریعے حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ کسی دوسرے سبب سے حاصل ہوا ہے (جیسے کسی نے ہبہ کر دیا یا وراثت میں حاصل ہوا) تو اس صورت میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ......اس صورت میں مال مستفاد کو مال سابق کے ساتھ ضم نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ دونوں کا الگ الگ سال شمار کیا جائے گا۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے: **قال من استفاد مالاً فلا زکوٰۃ فیہ حتی یحول علیہ الحول الخ** (ترمذی) کہ اگر کسی شخص کو مال مستفاد (حاصل) ہو تو اس میں جب تک سال نہ گزر جائے زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مال مستفاد کو مال سابق کے ساتھ ضم نہیں کیا جائے گا، بلکہ الگ رکھا جائیگا۔اور جب اس پر سال گزر جائے تب اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ مال سابق کے ساتھ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی جائے گی۔

جواب......یہ ہے کہ مذکورہ حدیث دو سندوں سے مروی ہے، جن میں سے ایک سند عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ دوسری سند صحیح ہے، مگر اس صورت میں جواب یہ ہے کہ یہ حدیث پہلی صورت سے متعلق ہے، یعنی اگر مال مستفاد مال سابق کی جنس سے نہ ہو تب یہ حکم ہے کہ مال مستفاد پر الگ سے سال شمار کیا جائے گا۔تیسری صورت سے یہ حدیث متعلق نہیں ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ......اس صورت میں مال مستفاد کو مال سابق کے ساتھ ضم کر دیا جائے گا۔

دلیل......یہ ہے کہ جس علّت کی بنیاد پر دوسری صورت میں مال مستفاد کو مال سابق کے ساتھ ضم کیا گیا ہے، وہ یہاں بھی موجود ہے کہ مال مستفاد مال سابق کی جنس سے ہے، اس لئے دونوں صورتوں کا ایک ہی حکم ہوگا۔ دوسرے

یہ کہ شریعت میں حرج کو دفع کرنے اور یسر پیدا کرنے کیلئے احکام میں تخفیف کی جاتی ہے، چنانچہ اگر یہاں تخفیف کی صورت اختیار نہ کی جائے تو زبردست حرج لازم آئے گا۔ کیونکہ ضم نہ کرنے کی صورت میں ہر روز آنے والی آمدنی کو علیحدہ رکھنا ہوگا، اور ہر ایک پر الگ الگ سال شمار کرنا ہوگا، اور اس میں بہت بڑا حرج ہے۔ اور انہوں (ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ) نے جو حدیث نقل کی ہے تو اس کے عموم پر خود ان کا بھی عمل نہیں ہے۔ چنانچہ جس طرح انہوں نے دوسری صورت کو حدیث میں مذکورہ حکم سے مستثنیٰ شمار کیا ہے اسی طرح حنفیہ نے تیسری صورت کو بھی دفعاً للحرج مستثنیٰ کر دیا فلا حرج فیہ۔

الزکوٰۃ فی الحلیّ

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......عورتوں کے زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔

دلیل......حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اس کے ساتھ اس کی بیٹی تھی جس کے ہاتھوں میں سونے کے دو موٹے موٹے کنگن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم کو آگ کے دو کنگن پہنائے۔ (ابوداؤد ج ا باب الکنز ماھو وزکوٰۃ الحلی)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......زیور میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

دلیل......ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مستدل قیاس ہے کہ زیور چونکہ استعمال کی چیز ہے۔ تو جس طرح استعمال کی دوسری چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اس طرح اس پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

جواب......قیاس نص کا مقابل نہیں بن سکتا۔

الزکوٰۃ فی مال الیتیم

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......مال یتیم میں زکوٰۃ واجب ہے۔

دلیل......حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب النّاس فقال الا من ولی یتیماً لہ مال فلیتجر فیہ ولا

یتر که حتی تاکله الصدقة (ترمذی) کہ خبردار! جو شخص کسی ایسے یتیم بچے کا سرپرست ہو، جس کے پاس کچھ مال ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کے مال میں تجارت کرے، اس کو یونہی نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ اس (مال) کو صدقہ ختم کردے۔ اس حدیث میں سرپرست کو مال یتیم میں تجارت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ تجارت کے ذریعہ نفع حاصل ہو اور مال میں اضافہ ہوتا رہے کیونکہ اگر وہ مال یونہی خالی رکھا رہے گا تو زکوٰۃ واجب ہوتی رہے گی اور مال میں کمی آجائے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مال یتیم میں زکوٰۃ واجب ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی مثنیٰ بن الصباح ہے جو کہ ضعیف ہے، اس لئے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں صدقہ سے نفقہ مراد ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے۔ اس لئے اس سے زکوٰۃ کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... مال یتیم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

دلیل...... حدیث نبوی ﷺ: **رفع القلم عن ثلاثة، عن النائم حتی یستیقظ، و عن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل.** (ابو داؤد) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمیوں سے قلم روک لیا گیا ہے: سونے والے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہوجائے، اور بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، اور مجنون سے یہاں تک کہ وہ عاقل ہوجائے۔ اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے احکام شریعت کا مکلّف نہیں ہوگا، اور زکوٰۃ بھی شریعت کا ایک حکم ہے۔ اس لئے یتیم بچہ زکوٰۃ کا بھی مکلّف نہیں ہوگا۔

الرّکاز

رکاز ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین میں گھاڑی یا دفن کی گئی ہو چنانچہ اس میں کنز (مدفون خزانہ) بالاتفاق داخل ہے۔ البتہ معدن کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا معدن رکاز ہے یا نہیں؟

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... معدن رکاز میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے معدن پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

دلیل...... یہ حضرات دلیل میں ایک محتمل روایت پیش کرتے ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا المعدن جبار (ترمذی) اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ معدن میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

جواب......(۱) حدیث کا یہ مطلب لینا کہ معدن پر زکوٰۃ نہیں ہے، حدیث کے سیاق وسباق کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس جملہ سے پہلے اور بعد میں دیت کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب کیسے لیا جاسکتا ہے کہ معدن میں زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ اس کا طلب بھی وہی ہوگا جو ماقبل اور مابعد سے میل کھاتا ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی کان میں گر کر مر جائے تو ہدر ہے، یعنی اس کی کسی پر دیت واجب نہیں ہے۔ (۲) اگر اس حدیث کا وہی مطلب لیا جائے جو انہوں نے لیا ہے کہ معدن میں زکوٰۃ نہیں ہے تو پھر وہ معدن ذہب اور معدن فضہ میں زکوٰۃ کے قائل کیوں ہیں؟ معلوم ہوا کہ ان کا بھی اس حدیث کے عموم پر عمل نہیں ہے۔

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ......معدن، رکاز میں شامل ہے۔ اور رکاز کی طرح معدن میں بھی زکوٰۃ واجب ہے۔

دلیل......(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: قال رسول اللہ ﷺ فی الرکاز الخمس، قیل وماالرّکاز یا رسول الله؟ قال الذهب الذی خلقه الله تعالیٰ فی الارض یوم خلقت (عمدۃ القاری:۹/۱۰۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رکاز میں خمس ہے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! رکاز کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ سونا ہے جو اللہ نے زمین کی پیدائش کے وقت اس میں پیدا فرمایا ہے۔ اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے رکاز کی تفسیر معدن سے فرمائی ہے جو کہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ رکاز میں معدن شامل ہے۔ (۲) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بناتے وقت ان کو جو صحیفہ لکھوا کر دیا تھا اس میں یہ الفاظ مرقوم تھے: وفی السیوب الخمس، اور السیوب کی تشریح میں علامہ جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: والسیوب الرکاز وهو المال المدفون فی الجاهلية او المعدن، دیکھئے رکاز کی اس تفسیر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ معدن، رکاز میں شامل ہے۔ (۳) ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: المعدن والرکاز واحد (عینی ص۱۰۰ ج۹) اور لغت بھی ہماری تائید کرتی ہے چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ

رکاز کا اطلاق معدن پر بھی ہوتا ہے۔(لسان العرب ص ۲۲۳ ج ۷، ومعارف السنن ص ۲۴۵ ج ۵) ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ معدن، رکاز میں داخل ہے۔ اور رکاز کی طرح اس میں بھی خمس واجب ہے۔

حکم الخرص

خرص کے لغوی معنی اندازہ لگانے کے ہیں اور اصطلاح میں خرص اس کو کہتے ہیں کہ حاکم کھیتوں اور باغوں کے پکنے سے پہلے ایک آدمی کو بھیج کر کھیتی کا اندازہ لگوائے کہ اس سال کس کے کھیت میں کتنی پیداوار ہو رہی ہے۔ اب اختلاف اس میں ہے کہ آیا خرص جائز ہے یا نہیں؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک.....خرص جائز ہے۔

دلیل......حدیث پاک ''**اذا خرصتم فخذوا**'' (ترمذی) نیز ایک دوسری روایت میں ہے: ''**امر النبی ﷺ ان یخرص العنب کما یخرص النخل الخ**'' (ابوداؤد وترمذی) اس حدیث میں باقاعدہ خرص کا حکم دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خرص جائز ہے۔

جواب......(۱) یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ساتھ خاص تھا۔ بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (۲) شیخ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہود خیانت کرتے تھے، اس لیے ان کے ساتھ خرص کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا تھا۔ (۳) یہ حکم ربوا کے حرام ہونے سے پہلے کا ہے، ربوا کی حرمت نازل ہونے کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک.....خرص جائز نہیں ہے۔

دلیل......(۱) حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث ہے: ''**نھی النبی ﷺ عن الخرص**''۔ (۲) حضرت جابرؓ کی ایک دوسری حدیث ہے: ''**ان النبی ﷺ نھی عن الخرص وقال أرأیتم ان ھلک التمر أیحبّ ان یا کل مال اخیہ بالباطل**'' (طحاوی) کہ نبی کریم ﷺ نے خرص سے منع فرمایا، اور فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو اس کے بارے میں کہ اگر کھجور بیکار ہو جائے تو کیا کوئی پسند کرے گا کہ اپنے بھائی کے مال کو باطل طریقہ سے کھائے۔ اس حدیث سے بھی خرص کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے، پھر یہ کہ خرص ایک تخمینی چیز ہے۔ جس میں خطا کا بھی احتمال ہے۔ اس لئے کسی تخمینی چیز پر کوئی حکم لگانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

نقل الزکوٰۃ من بلد الی بلد اٰخر

ایک شہر کی زکوٰۃ دوسرے شہر کے لوگوں کو دینی جائز ہے یا نہیں؟

حضرات شوافع و مالکیہ کے نزدیک...... جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حدیث معاذؓ میں ہے: ''ان اللّٰہ قد فرض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم'' (مسلم:۱/۳۶، بخاری:۱/۲۰۳، ترمذی واللفظ للبخاری) کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو کہ ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے ہی فقراء کو دی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ دوسرے شہر کے فقراء کو دینا جائز نہیں ہے۔

جواب...... حدیث مذکور میں اغنیائھم اور فقرائھم میں ھم ضمیر کا مرجع اہل بلد نہیں ہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ تو اب حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو کہ مسلمانوں کے مالداروں (صاحب نصاب لوگوں) سے لی جائے گی اور مسلمانوں ہی کے فقراء کو دی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ مقصود مسلمان فقراء تک پہنچانا ہے، اب خواہ وہ اسی شہر کے ہوں خواہ دوسرے شہر کے (عینی)۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ و دیگر فرماتے ہیں کہ...... ایک شہر کی زکوٰۃ دوسرے شہر کو منتقل کرنا جائز ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اطراف کی زکوٰۃ مدینہ منورہ کو منگا لیا کرتے تھے۔ جو کہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اگر جائز نہ ہوتی تو آپ ﷺ ہرگز نہ منگاتے۔

الجمع و التفریق

ولا یجمع بین متفرّق، ولا یفرّق بین مجتمع. (بخاری ۴۵۰، ترمذی)

ائمہ ثلاثہؒ: فرماتے ہیں کہ...... اگر مال دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہو تو زکوٰۃ ہر شخص کے الگ الگ حصہ پر نہیں، بلکہ مجموعہ پر واجب ہوتی ہے، مثلاً اسّی بکریاں دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہیں تو زکوٰۃ اسّی بکریوں پر واجب ہوگی، اور یہ سمجھا جائیگا کہ یہ اسّی بکریاں

ایک ہی شخص کی ملکیت ہیں، اور چونکہ اسّی بکریوں پر نصاب نہیں بدلتا، بلکہ وہی ایک بکری واجب رہتی ہے جو چالیس پر واجب تھی، اس لئے صرف ایک بکری زکوٰۃ میں دینی ہوگی، حالانکہ اگر دونوں کے حصوں کا الگ الگ اعتبار کیا جائے تو ہر شخص کے حصہ میں چالیس بکریاں آتی ہیں، اس صورت میں ہر شخص پر ایک ایک بکری واجب ہونی چاہئے، لیکن دونوں کے اشتراک کی وجہ سے ہر شخص سے الگ الگ بکری وصول کرنے کے بجائے مجموعے سے صرف ایک بکری وصول کرلی جائیگی، اور اسی سے دونوں کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔

پھر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک اس اشتراک کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دونوں شخص ملکیت کے اعتبار سے مال میں شریک ہوں۔ اس کو خلطة الشیوع (ملکیت کی شرکت) کہا جاتا ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں شخص ملکیت میں شریک نہ ہوں، البتہ دونوں کا باڑہ ایک ہو اور کم از کم چار چیزیں مشترک ہوں چرواہا، چراگاہ، دودھ دوہنے والا اور نر (یعنی راعی، مرعیٰ، حالب اور فحل) اس صورت کو خلطۃ الجوار کہتے ہیں۔ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک خلطۃ الجوار کا بھی اسی طرح اعتبار ہے جس طرح خلطۃ الشیوع کا ہے چنانچہ خلطۃ الجوار کی بھی زکوٰۃ دونوں اشخاص کے مجموعی مال پر واجب ہوگی۔ پھر یاد رکھنا چاہئے کہ مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں کبھی زکوٰۃ، انفرادی زکوٰۃ کے مقابلے میں کم آتی ہے اور کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے مذکورہ بالا جملوں کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے خوف سے نہ دو آدمی مال کے اندر خلطۃ الشیوع یا خلطۃ الجوار پیدا کر کے اس کو اکٹھا کریں اور نہ اسے علیحدہ کریں بلکہ جس حالت پر ہے اسی حالت پر رہنے دیں، مثلاً اگر دو آدمیوں کی اسّی بکریاں ہوں تو الگ الگ ہونے کی صورت میں دو بکریاں واجب ہوں گی۔ ایک آدمی کی چالیس پر ایک اور دوسرے آدمی کی چالیس پر ایک اور مشترک ہونے کی صورت میں مجموعہ (یعنی اسّی) بکریوں پر صرف ایک ہی واجب ہوگی۔ تو اب ایسے دو آدمی جن کے درمیان نہ خلطۃ الشیوع ہے، نہ خلطۃ الجوار، زکوٰۃ کم کرنے کی نیت سے آپس میں شرکت پیدا کرلیں تو یہ ناجائز ہے، اور اسی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **لا یجمع بین متفرّق** کہ الگ الگ مال کو اکٹھا نہ کیا جائے۔ (یعنی

کوئی شرکت پیدا کر کے) اسی طرح اگر دو آدمیوں کے درمیان دو سو بکریاں مشترک ہوں تو تین بکریاں واجب ہوتی ہیں اور اگر وہ شرکت کو ختم کر دیں اور آدھی آدھی تقسیم کر لیں تو ہر ایک کے پاس سو بکریاں رہ جائیں گی اور ہر آدمی پر صرف ایک بکری واجب ہوگی لہٰذا اگر شرکت کو اس نیت سے ختم کیا تاکہ زکوٰۃ کم واجب ہو تو یہ ناجائز ہے اور اسی کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: **لا یفرّق بین مجتمع** کہ مجتمع مال کو الگ نہ کیا جائے (یعنی شرکت کو ختم کر کے)۔

احناف کے نزدیک...... نہ خلطۃ الشیوع کا اعتبار ہے اور نہ خلطۃ الجوار کا، بلکہ ہر صورت میں زکوٰۃ ہر شخص کے اپنے حصہ پر واجب ہوگی، مجموعہ پر نہیں۔ چنانچہ اگر اسّی بکریاں دو شخصوں کے درمیان نصف نصف مشترک ہوں (خواہ ملکاً یا جواراً) تو چونکہ ہمارے نزدیک مشترک ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے ہر شخص پر الگ الگ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ شرکت کی وجہ سے مجموعہ سے زکوٰۃ لی جائے اور اسّی بکریوں میں سے صرف ایک بکری وصول کی جائے، بلکہ ہر ایک کی چالیس بکریوں سے علیحدہ علیحدہ ایک ایک بکری وصول کی جائے گی۔ رہی حدیث تو اس میں کوئی الگ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی کی نفی کی گئی ہے کہ خلطہ (شرکت) زکوٰۃ کی کمی یا زیادتی میں کچھ مؤثر نہیں ہے اس لئے اگر تم زکوٰۃ کو کم کرنے کی نیت سے خلطہ پیدا کرنا چاہو یا زکوٰۃ کی زیادتی سے بچنے کے لئے خلطہ کو ختم کر دو تو یہ سارے حربے بیکار ہیں کیونکہ زکوٰۃ ہر شخص کے اپنے حصہ پر واجب ہوگی اس لئے فرمایا گیا: **لا یجمع بین متفرّق** کہ متفرق مال کو اکٹھا نہ کیا جائے" **ولا یفرّق بین مجتمع**" اور مجتمع مال کو الگ نہ کیا جائے بلکہ دونوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ (ماخوذ از تقریر عثمانی)

الصدقة عن الميت

امام مالک وشافعی رحمہما اللہ کے نزدیک...... عبادات بدنیہ کا ایصال ثواب درست نہیں ہے۔

دلیل...... وہ فرماتے ہیں کہ صدقہ، دعا اور حج کے علاوہ کسی عمل کا ایصال ثواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے، خصوصاً عبادات بدنیہ کے ایصال ثواب کا کہیں ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اس لئے صدقہ، دعا اور حج کے علاوہ بقیہ اعمال کا ایصال ثواب درست نہیں ہے۔

جواب......حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر چیز کا ثبوت ضروری نہیں ہے۔ جب صدقہ، دعا اور حج کا ثبوت مل گیا تو اب بقیہ اعمال کو بھی اسی پر قیاس کرلیا جائے گا یہ ضروری نہیں ہے کہ مسئلہ کا ہر ہر جز ثابت بالسنہ ہو ورنہ پھر قیاس کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

امام اعظم و احمد رحمہما اللہ کے نزدیک......ہر عمل کا ایصال ثواب درست ہے۔

دلیل......قرآن کریم میں دعا کے ایصال ثواب کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيراً** '' نیز حدیث میں ہے: ''**عن سعد بن عبادة ان امّه ماتت فقال للنبی ﷺ وسلم اتصدق عنها قال نعم** '' (نسائی) حضرت سعد بن عبادہؓ سے مروی ہے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، تو انہوں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں ان کی جانب سے صدقہ کرسکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں''۔

اس حدیث سے صدقہ کا ایصال ثواب ثابت ہوتا ہے نیز ایک دوسری حدیث سے نماز و روزہ کے ایصال ثواب کا ثبوت ملتا ہے: ''**ان النبی ﷺ قال ان من البر بعد البران تصلی لوالديک مع صلوتک وان تصوم لهما مع صيامک** '' (دارقطنی) کہ نیکی کے بعد نیکی یہ ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ اپنے والدین کے لئے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزہ کے ساتھ اپنے والدین کے لئے بھی روزہ رکھے۔ ان تمام احادیث کے پیش نظر یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان اپنے مردوں کیلئے ہر عمل کا ایصال ثواب کرسکتا ہے۔ خواہ وہ عبادات غیر بدنیہ ہوں یا عبادات بدنیہ محضہ ہوں۔

حكم صدقة الفطر

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک......صدقۂ فطر (فطرانہ) واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......صدقۂ فطر فرض ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل......حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت ہے: ''**ان النبیّ ﷺ بعث مناديا فی فجاج مكّة الا انّ صدقة الفطر واجبة علىٰ كل مسلم ذكر او انثیٰ، حرّ او عبد، صغير او كبير** '' الحدیث (ترمذی، باب فی صدقۃ الفطر) کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ کی گلیوں میں ایک

منادی (اعلان کرنے والا) بھیجا (اس نے اعلان کیا کہ) سن لو! صدقۂ فطر ہر مسلمان مرد، عورت، غلام، آزاد، چھوٹے اور بڑے (سب) پر واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کی دلیل...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: ''**قال فرض رسول اللہ ﷺ صدقة الفطر علی الذکر والانثیٰ والحر والمملوک**''. (حوالہ بالا) (۱) حدیث میں ''فَرَضَ'' ، اَلْزَمَ اور اَوْجَبَ کے معنی میں ہے۔ (سبل السلام ج:۲، فتح الملہم ج ۳، بحوالہ ابن عبد البر رحمہ اللہ) اس لئے یہ روایت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف نہیں بلکہ ان کے حق میں ہے۔ (۲) صدقۂ فطر کا منکر بالاتفاق کافر نہیں ہے، حالانکہ فرض کا منکر کافر ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ صدقۂ فطر واجب ہے نہ کہ فرض۔

نصاب صدقة الفطر

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... صدقۂ فطر صاحبِ نصاب پر واجب ہے۔ (صدقۂ فطر کے وجوب کیلئے نصابِ زکوٰۃ شرط ہے)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... صدقۂ فطر ہر اس شخص پر فرض ہے جس کے پاس ایک دِن کی ضروریات سے زائد مال ہو۔ (صدقۂ فطر کی فرضیت کے لئے نصاب (زکوٰۃ) شرط نہیں ہے)

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کی دلیل...... ذخیرۂ حدیث میں کہیں بھی صدقۂ فطر کا کوئی نصاب بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا جس کے پاس ایک دن کی ضروریات سے زائد مال ہو، اس کو بھی صدقۂ فطر کا حکم شامل ہوگا۔

جواب...... عدم ذکر عدم شئی کو مستلزم نہیں ہوتا، یعنی ذکر نہ کرنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کے لئے نصاب ہی نہ ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: **کنّا نخرج زکوٰة الفطر ۔الحدیث** (ترمذی باب فی صدقة الفطر) نیز اسی باب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں بھی ''زکوٰۃ'' کا لفظ مستعمل ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں ''لفظ زکوٰۃ'' کا استعمال اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو نصاب زکوٰۃ کا ہے، وہی بعینہٖ صدقۂ فطر کا بھی نصاب ہے۔

المبیت فی نیّۃ الصوم

کیا روزہ کی نیت رات کو کرنا ضروری ہے؟

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... روزہ کی نیت رات کو کرنا ضروری ہے خواہ فرض ہو یا نفل۔
امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک...... فرض روزہ کی نیت رات کو کرنا ضروری ہے، نفل کی نہیں۔

دلیل...... حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''من لم یجمع الصیام قبل الفجر فلا صیام له'' (ترمذی) اس حدیث میں صبح صادق سے پہلے نیت کرنے کو ضروری بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر طلوع فجر سے پہلے نیت نہیں کرے گا تو اس کا روزہ ہی نہیں ہوگا۔

جواب...... یہ ہے کہ اس حدیث کے مرفوع وموقوف ہونے میں اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ نفی کمال پر محمول ہے اس لئے بھی اس سے رات میں نیت کا وجوب ثابت نہیں ہوسکتا۔
امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... نفل اور صوم معین کی نیت زوال سے پہلے تک کرسکتے ہیں رات میں کرنا ضروری نہیں ہے۔

دلیل...... حدیث پاک میں ہے: ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر رجلا ان اذّن فی الناس اذ فرض صوم عاشوراء: الامن اکل فلیمسک ومن لم یاکل فلیصم'' (شیخین) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں میں آواز لگائے جب کہ عاشورہ کا روزہ فرض کیا گیا کہ خبردار! جس شخص نے کچھ کھالیا ہو وہ اب رُک جائے اور جس نے (ابھی تک کچھ) نہیں کھایا ہے وہ روزہ رکھے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس حدیث میں دن میں روزے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اب جن لوگوں نے اس اعلان کے بعد روزہ رکھا انہوں نے نیت بھی دن میں کی ہوگی۔ معلوم ہوا کہ زوال سے پہلے پہلے دن میں نیت کرسکتے ہیں۔ رات کو نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ صوم غیر معین جیسے رمضان کی قضا یا نذر مطلق وغیرہ تو اس میں ہمارا مسلک بھی یہی ہے کہ نیت رات میں کی جائے گی۔

الصوم عن المیّت

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... اگر میت پر روزوں کی قضا واجب تھی تو اب ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے گا۔

دلیل......(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:'' ان النبی ﷺ قال من مات وعلیه صیام صام عنه ولیه '' (بخاری:۱۹۵۲، مسلم:۲۶۸۷) کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مر گیا اور اس پر روزے واجب تھے۔ تو اس کی جانب سے اس کا ولی روزے رکھے۔ (۲) حدیث:'' ان امراۃ قالت ان امّی ماتت وعلیها صیام أفأصوم عنها قال النبی ﷺ صومی عنها '' کہ ایک عورت نے عرض کیا میری والدہ مرگئی ہے اور ان پر روزے واجب تھے تو کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھ لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: رکھ لو۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولی کیلئے میت کی جانب سے روزے رکھنا جائز ہے۔

جواب......پہلی حدیث کی سند میں ایک راوی عبید اللہ بن ابی جعفر ہے اور وہ منکر الحدیث ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ اس حدیث کے خلاف ہے اس لئے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس میں صوم سے روزے کا قائم مقام یعنی اطعام طعام مراد ہے یا پھر صوم سے روزہ ہی مراد ہے لیکن بطریق نیابت نہیں بلکہ ایصالِ ثواب اور تبرع کی نیت سے۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک......ولی، میت کی جانب سے روزہ رکھنے کا مجاز نہیں ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید ہے۔

دلیل......حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے:'' ان النبی ﷺ قال لا یصوم احد عن احد ولکن یطعم عنه '' (نسائی) کہ کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے روزہ نہ رکھے بلکہ اس کی طرف سے کھانا کھلا دے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صوم عن الغیر سے منع فرمایا ہے نیز ایک دوسری حدیث میں ہے: ان النبی ﷺ قال من مات وعلیه صوم شهر فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکیناً '' (قرطبی) ملاحظہ فرمائیں، اس حدیث میں میت کی جانب سے روزہ رکھنے کے بجائے مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کی جانب سے روزے نہیں رکھے جائینگے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی اسی حدیث کی تائید کرتی ہیں چنانچہ وہ فرماتی

ہیں: ''لا تصوموا عن موتاكم واطعموا عنهم'' (بیہقی) کہ اپنے مردوں کی جانب سے روزے مت رکھو بلکہ ان کی طرف سے کھانا کھلاؤ۔

كتاب الحج

اى الحج افضل؟

حج کی تین قسمیں ہیں: (۱) افراد۔ (۲) تمتع۔ (۳) قِران۔

افراد...... حج افراد یہ ہے کہ آدمی میقات سے صرف حج کا احرام باندھے۔

تمتع...... حج تمتع یہ ہے کہ آدمی اشہرِ حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھے، پھر عمرے سے فارغ ہوکر اسی سال حج کا احرام باندھے۔

قِران...... حج قران کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور پھر عمرہ کا احرام کھولنے سے پہلے اسی احرام میں حج کی نیت کرے۔

اب اختلاف اس میں ہے کہ ان تینوں میں سے کون سا حج افضل ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... حج تمتع افضل ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے: ''تمتع رسول الله ﷺ في حجة الوداع بالعمرة الى الحج'' اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حج تمتع فرمایا ہے۔ اور جب حضور اکرم ﷺ نے حج تمتع فرمایا ہے تو حج تمتع افضل ہوگا۔

جواب...... (۱) لفظ تمتع عام ہے جو کہ قران کو بھی شامل ہے، اس لئے یہاں تمتع سے قِران ہی مراد لیا جائے گا۔ (۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور انہی سے قران کی بھی روایت مروی ہے۔ (۳) تمتع سے مراد تمتع لغوی ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے عمرہ کے ساتھ حج کو ملا کر دونوں کو ایک ہی سفر میں ادا کر کے نفع حاصل کیا، ہر ایک کے لئے الگ الگ سفر کرنا نہیں پڑا۔

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... حج افراد افضل ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث ہے: ''ان النبي ﷺ اهل

بالحج مفردا ''(مسلم) نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے: ''ان النبی ﷺ اھل بالحج وحدہ ''(مسلم) ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حج افراد فرمایا ہے۔اس لئے حج افراد افضل ہے۔

جواب......(۱) ان احادیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا حج کیا اس کے ساتھ عمرہ نہیں کیا جس کو حج افراد کہتے ہیں۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ حج کے اعمال کو مستقل ادا کیا۔(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے لئے مستقل احرام باندھا لیکن اصل میں قارن تھے۔(۳) قارن کے لئے چونکہ تین طرح کے تلبیہ (دعا یعنی، لبیک اللھم لبیک...... الخ) کہنے کی اجازت ہے اور اس میں ایک تلبیہ ''لبیک بحجة '' بھی ہے، اس تلبیہ کو بعض حضرات نے حضور اکرم ﷺ سے سن کر یہ سمجھا کہ آپ ﷺ حج افراد فرمارہے ہیں۔اس لئے کہ اس تلبیہ میں صرف حج کا ذکر ہے عمرہ کا ذکر نہیں ہے۔حالانکہ قارن بھی اس تلبیہ کو پڑھ سکتا ہے۔چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے اگر اس تلبیہ کو پڑھا تب بھی آپ ﷺ قارن ہی رہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......حج قران افضل ہے۔

دلیل......حدیث نبوی ﷺ ہے: ''عن عمرؓ قال سمعت النبی ﷺ بوادی العقیق یقول اتانی اللیلة اٰتٍ من ربی عزوجل فقال صلّ فی ھذا الواد المبارک رکعتین وقل عمرة فی حجة'' (بخاری) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے وادی عقیق میں حضور اکرم ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرمارہے تھے کہ رات کو میرے پاس میرے پروردگار کی جانب سے ایک آنے والا آیا۔اور اس نے کہا کہ اس مبارک وادی میں دو رکعت نماز ادا کیجئے اور حج کے ساتھ عمرہ بھی کیجئے۔ملاحظہ فرمائیے۔اس حدیث میں اللہ کی جانب سے حضور اکرم ﷺ کو حج قران کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔تو ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حج قران ہی ادا کیا ہے۔اور جب حضور اکرم ﷺ نے حج قران ادا کیا ہے تو یہی افضل ہوگا۔پس ثابت ہوگیا کہ حج قران افضل ہے۔

حج قران کی وجوہِ ترجیح......(۱) قِران کی روایات زیادہ ہیں۔(۲) قِران والی روایات مثبت زیادت ہیں اور مثبت، نافی سے راجح ہے۔(۳) افراد اور تمتع کی روایات قِران کا احتمال رکھتی ہیں، یعنی ہوسکتا ہے کہ قارن نے صرف ایک طرح کا تلبیہ پڑھا ہو (اس لئے کہ

قارن کے لئے تین طرح تلبیہ پڑھنے کی اجازت ہے) مگر قران کی روایت (لبیک بحجة وعمرة) میں افراد وتمتع کی تاویل نہیں ہوسکتی۔ (معارف السنن ص:۵۵،ج:٦)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ قران کے مرجحات کے بارے میں لکھتے ہیں: ومقتضي ذلک ان یکون القِران افضل من الافراد والتمتع وهو قول جماعة من الصحابة رضی الله عنهم والتابعين رحمهم الله اه (معارف السنن، اوجز المسالک، فتح الملہم)

مسئلة الاحصار فی الحج

احصار.....لغت میں ''روکنے'' کو کہتے ہیں اور شریعت میں احصار یہ ہے کہ آدمی حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد دشمن یا مرض کی وجہ سے حج یا عمرہ کے ادا کرنے پر قادر نہ ہو۔ اس بارے میں ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال مختلف ہیں کہ احصار کا سبب کیا ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک.....عدوّ (دشمن) اور مرض دونوں احصار کا سبب ہے۔

دلیل.....حضرت حجاج بن عمروؓ کی روایت ہے: ''قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من كُسر اوعرج فقد حلَّ، وعليه حجة اُخرىٰ'' (ترمذی ج۱) کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کسی آدمی کا عضو ٹوٹ گیا یا لنگڑا ہوگیا تو وہ احرام کھول لے اور اس پر حج کی قضاء لازم ہے۔

ملاحظہ فرمائیے: یہ حدیث صراحةً دلالت کرتی ہے کہ احصار عدوّ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کسر وعرج جیسے دوسرے عوارض سے بھی احصار متحقق ہوجاتا ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک.....احصار کا سبب صرف عدوّ ہے۔

دلیل.....آیت کریمہ ''فان احصرتم فما استيسر من الهدی'' (سورۃ البقرہ) کا سبب نزول ہے کہ اس آیت میں مسئلہ احصار کا ذکر ہے جو ٦ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ دشمن کی طرف سے پیش آئی تھی، لہٰذا احصار عدوّ کے ساتھ خاص ہوگا۔

جواب.....ائمہ لغت نے لکھا ہے کہ احصار کا لفظ حقیقتاً ''حبس بالمرض'' کے لئے وضع کیا گیا ہے اور ''حبس بالعدوّ'' میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

وجوہ ترجیح مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ.....امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب لغۃً، روایۃً اور

درایۃً (ہر اعتبار سے) راجح ہے۔(۱) لغۃً اس لئے کہ لغت کے اعتبار سے احصار کا لفظ ’’حبس بالمرض‘‘ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ (۲) روایۃً: حضرت حجاج بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے راجح ہے۔ (۳) درایۃً: اس لئے راجح ہے کہ جو علّت احصار بالعدوّ میں پائی جاتی ہے وہی علت احصار بالمرض میں بھی پائی جاتی ہے جو کہ عدم وصول الی الکعبہ ہے۔

محصَر کا حکم:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ..... محصر زمین حرم میں ہدی (قربانی کا جانور) بھیجے اور اس کے ذبح کا وقت مقرر کرلیا جائے (کہ اس کو مثلاً دس بجے ذبح کیا جائے) جب مقررہ وقت (مثلاً دس بجے کا وقت) آجائے تو حلال ہو جائے (یعنی احرام کھول لے)۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ..... ہدی کو حرم میں بھیجنا ضروری نہیں، بلکہ جہاں احصار پیش آیا وہاں ذبح کیا جائے اور صلح حدیبیہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جائے احصار (حدیبیہ) میں جانور ذبح کئے تھے۔

جواب ...... امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مقامِ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے اور کچھ حرم سے خارج، اور ذبح داخلِ حرم میں ہوا تھا، آیت کریمہ: ’’حتّٰی یبلغ الھدی محِلّہ‘‘ سے اشارۃ النص کے طور پر امام صاحبؒ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

طواف القارن

ایسا شخص جس نے حج کے ساتھ عمرہ کا بھی احرام باندھا ہو، قارن کہلاتا ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ حج وعمرہ کے لئے دو طواف کرے گا یا دونوں کے لئے صرف ایک طواف کرے گا؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... قارن کے ذمہ تین طواف ہیں، طواف قدوم، طواف وداع اور طواف زیارت اور اسی تیسرے طواف میں عمرہ کا طواف بھی شامل ہے۔ عمرہ کے لئے الگ سے طواف نہیں کیا جائے گا۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ’’واما الذین جمعوا بین الحج والعمرۃ فانما طافوا طوافاً واحداً‘‘ (بخاری ومسلم)۔ نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''لم یطف النبی ﷺ ولا اصحابه بین الصفا والمروة الّا طوافاً واحداً'' (مسلم:۱/۴۱۴) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے صفاومروی کے درمیان عمرہ اور حج کے لئے صرف ایک طواف کیا۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''ان النبی صلی الله علیه وسلم طاف طوافاً واحداً فی حجته وعمرته'' ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قارن حج اور عمرہ دونوں کے لئے صرف ایک طواف کرے گا دونوں کے لئے الگ الگ طواف نہیں کرے گا۔ گویا کہ طواف زیارت میں طواف عمرہ کا تداخل ہو گیا ہے۔

جواب...... ایسی تمام احادیث جن میں حج وعمرہ کا صرف ایک طواف مذکور ہے، ان کا جواب یہ ہے کہ ان میں عمرہ کے ساتھ جو دوسرے طواف کو شامل کیا گیا ہے وہ طواف قدوم ہے جو کہ سنت ہے طواف زیارت نہیں اس لئے کہ طواف زیارت فرض ہے جس کو مستقل علیحدہ سے کرنا ہے اس لئے ان کے ساتھ طواف عمرہ کو شامل کر کے دونوں کے لئے ایک طواف کو کافی کہنا صحیح نہیں ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... قارن کے ذمہ چار طواف ہیں (کیونکہ ان کے نزدیک عمرہ اور حج دونوں کے لئے الگ الگ طواف کیا جائے گا) اور وہ یہ ہیں: طواف قدوم، طواف وداع، طواف زیارت اور طواف عمرہ۔

دلیل...... حدیث میں ہے: ''عن ابن عمر رضی الله عنهما انه جمع بین الحج والعمرة وطاف لهما طوافین وسعی لهما سعیین وقال هٰكذا رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم صنع كما صنعت'' (دار قطنی ص ۲۵۸ ج ۲) کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ کئے تو دونوں کے لئے دو طواف کئے اور دو سعی کیں اور کہا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ (۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''عن علی رضی الله عنه انه طاف لهما طوافین وسعی لهما سعیین و قال هٰكذا رایت رسول الله صلی

اللہ علیہ وسلم صنع'' کہ انہوں نے حج وعمرہ کے لئے دوطواف اور دو سعی کیں اور کہا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ ان تمام احادیث وآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ حج وعمرہ دونوں کے لئے الگ الگ طواف کیا جائے گا۔ دونوں کے لئے ایک طواف کافی نہ ہوگا۔

نوٹ...... سعی کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے جو طواف کے بارے میں ہے۔

الترتیب فی مناسک الحج

یوم النحر یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ میں قارن اور متمتع کے لئے بالاتفاق چار افعال ہیں اولاً رمی، پھر ذبح، پھر حلق، پھر طواف زیارت اور اس ترتیب کی مطلوبیت پر بھی سب کا اجماع ہے لیکن ترتیب کی سنّیت اور وجوب میں اختلاف ہے کہ آیا یہ ترتیب سنت ہے یا واجب؟

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... افعال کی یہ ترتیب سنت ہے اس لئے افعال کی تقدیم وتاخیر موجب دم نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیث ہے: '' **ان النبی ﷺ وقف فی حجة الوداع بمنی للناس یسئلونه فجاءه رجل وقال لم اشعر فحلقت قبل ان اذبح فقال اذبح ولا حرج فجاء رجل وقال لم اشعر فنحرت قبل ان ارمی فقال ارم ولا حرج فما سئل النبی ﷺ عن شئی قدّم ولا اخرّ الّا قال افعل ولا حرج.** (بخاری باب الفتیا وھو واقف علی الدابۃ) نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں لوگوں کے پاس کھڑے ہوئے تاکہ لوگ آپ ﷺ سے سوال کریں پس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا مجھ کو معلوم نہیں تھا میں نے ذبح سے پہلے حلق کرا لیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب ذبح کرلو کوئی حرج نہیں ہے، پھر ایک آدمی آیا اس نے عرض کیا کہ مجھے معلوم نہیں تھا اور میں نے رمی سے پہلے ذبح کرلیا آپ ﷺ نے فرمایا کوئی بات نہیں ہے اب رمی کرلو، پس جس چیز کی بھی تقدیم وتاخیر کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا آپ ﷺ نے ایک ہی جواب مرحمت فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے جو رہ گیا، اس کو اب کرلو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب سنت ہے واجب نہیں ہے اس لئے کہ اگر

ترتیب واجب ہوتی تو آپ ﷺ اس کے چھوٹ جانے پر ''لا حرج'' نہ فرماتے۔
جواب...... آپ ﷺ نے لاحرج سے گناہ کی نفی فرمائی ہے کہ اگر بھول سے کوئی فعل آگے پیچھے ہوجائے تو اس میں گناہ نہیں ہے دم واجب ہونے کی نفی نہیں فرمائی ہے اس لئے دم واجب ہوگا۔
امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... ترتیب واجب ہے اس لئے اس کے ترک سے دم واجب ہوگا۔

دلیل...... حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ''**قال من قدّم شیئاً من حجه اواخّر فلیهرق لذٰلک دماً**'' (مشکوٰۃ) کہ جو شخص افعال حج میں سے کسی کو مقدم یا مؤخر کردے وہ اس کے لئے دم دے اسی طرح کے الفاظ حضرت جابرؓ، ابراہیم نخعیؒ وحضرت سعید ابن جبیرؒ سے بھی مروی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوم النحر کے وظائف اربعہ میں ترتیب واجب ہے۔

کتاب النّکاح

لا نکاح الّا بولیّ

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... آزاد عورت کا نکاح بغیر ولی کی اجازت کے منعقد نہیں ہوتا۔

دلیل...... (۱) آیت کریمہ ہے: ''**وانکحوا الایامٰی منکم**'' (سورۃ النور پ ۱۸) اس آیت میں اولیاء کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ تم عورتوں کی شادی کردو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی شادی اولیاء کریں گے بغیر ان کے شادی نہیں ہوسکتی۔ اور حدیث میں ہے: ''**لا نکاح الابولی**'' (ابو داؤد) (۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: **ایّما امرأة نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل فنکاحها باطل** '' (ترمذی وابوداؤد) ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح منعقد ہونے کے لئے ولی کی اجازت ضروری ہے۔ بغیر اس کی اجازت کے نکاح منعقد نہیں ہوسکتا۔

جواب...... یہ ہے کہ آیت کریمہ میں عورتوں کی بجائے اولیاء سے اس لئے خطاب کیا گیا ہے کیونکہ عورت باحیا ہوتی ہے، خود سے نکاح کے لئے نہیں کہہ سکتی، دوسرے یہ کہ نکاح کے لئے محفل نکاح میں جانا ہوتا ہے وہاں بھی عورت نہیں جاسکتی۔ اس لئے اولیاء سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ بغیر اس کے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ اور حدیث اول کا جواب یہ

ہے کہ اس میں اضطراب ہے یا یہ کہا جائے گا کہ اس میں نفی کمال کے لئے ہے۔ اور دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کی راویہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اور اس کا مدار حضرت زہری رحمہ اللہ پر ہے اور دونوں کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں عورت سے باندی مراد ہے کہ باندی کا نکاح بغیر ولی و مولیٰ کے نہیں ہوسکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... آزاد عورت کا نکاح بغیر ولی کے ہوسکتا ہے۔

دلیل...... قرآن کریم میں متعدد جگہ نکاح کرنے کی اضافت عورتوں کی جانب کی گئی ہے چنانچہ ارشاد باری ہے: ''واذا طلّقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن '' (سورۃ البقرۃ پ۲) اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو۔ اور ان کی عدت مکمل ہو جائے تو تم ان کو دوسرے شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو۔ اس میں نکاح کرنے کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت اپنے نکاح کی خود حقدار ہے۔ (۲) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ''ان النبی ﷺ قال الایم احق بنفسھا من ولیھا '' (مسلم) کہ عورت اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حقدار ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ خود نکاح کرسکتی ہے نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کی غیر موجودگی میں ان کی لڑکی حفصہ کا نکاح کردیا تھا۔ (طحاوی) اور نکاح منعقد ہو گیا تھا۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغیر ولی کے نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

ولایۃ الاجبار

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... ولایت اجبار کا دارومدار بکارت (عورت کے باکرہ اور ثیبہ ہونے) پر ہے۔ یعنی عورت جب تک باکرہ رہے گی، ولی کو اس پر ولایت اجبار حاصل ہوگی۔ اور جب وہ ثیبہ ہو جائے گی تو ولایت ختم ہو جائے گی۔

امام اعظمؒ کے نزدیک...... ولایت اجبار کا دارومدار صغر اور کبر پر ہے کہ جب تک وہ صغیرہ رہے گی، ولایت اجبار حاصل ہوگی اور جب وہ کبیرہ ہو جائے گی تو ولایت ختم ہو جائے گی۔

دلیل شوافعؒ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''انّ رسول اللہ ﷺ قال الایم احق بنفسھا من ولیھا ''

(ت:۱۱۰۸) کہ عورت اپنی ذات کے بارے میں ولی سے زیادہ حقدار ہے اور عورت سے یہاں ثیبہ مراد ہے۔اب اگر اس کا مفہوم مخالف نکالا جائے تو یہ عبارت ہوگی"و البکر لیست احق بنفسھا من ولیھا" کہ باکرہ اپنی ذات پر ولی سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔اسی مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ باکرہ اپنے نکاح کی حقدار نہیں ہے بلکہ ولی کو اس پر ولایت اجبار حاصل ہے۔اور ثیبہ اپنے نکاح کی حقدار ہے اس لئے اس پر ولی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہوگی۔

جواب...... یہ ہے کہ مفہوم مخالف اکثر کے نزدیک حجت نہیں ہے۔نیز احادیث سے جو باکرہ بالغہ پر ولایت اجبار کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے اس کے مقابلے میں بھی مفہوم مخالف مرجوح ہو جائے گا۔

دلیل احنافؒ......حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے جس میں ہے:"ولا تنکح البکر حتی تستاذن"(ت:۱۱۰۷)اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے:"ان جاریۃ بکرا اتت النبی ﷺ فذکرت انّ اباھا زوّجھا وھی کارھۃ،فخیّرھا النبی ﷺ"(ابوداؤد۲۰۹۶) کہ ایک باکرہ لڑکی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میری شادی کردی،حالانکہ میں راضی نہیں تھی،پس حضور اکرم ﷺ نے اس کو خیار فسخ عنایت فرمایا کہ اگر تو چاہے تو نکاح فسخ کردے۔اس سے بھی معلوم ہوا کہ باکرہ پر ولایت اجبار حاصل نہیں ہوتی اور جب باکرہ اور ثیبہ ہونے پر ولایت اجبار کا مدار نہیں ہوا،تو دوسری شق متعین ہوگئی اور ثابت ہوگیا کہ ولایت اجبار کا دارومدار صغر اور کبر پر ہے۔

کون المھر مالاً

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......مہر کا مال ہونا ضروری نہیں ہے،یہی ایک روایت امام احمد رحمہ اللہ کی ہے۔

دلیل......حدیث نبوی ﷺ:"عن سھل بن سعد رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال زوجتکھا بمامعک من القراٰن"(ترمذی) آپ ﷺ

نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تیری شادی اس سے کردی اس قرآن کے عوض جو تیرے ساتھ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے قرآن کو مہر قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم جو کہ آدمی کو یاد ہوتا ہے وہ مال نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہر کا مال ہونا ضروری نہیں ہے۔

جواب...... (۱) یہ حدیث خبر واحد ہے، جس کی وجہ سے آیت کریمہ کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ (۲) ''**بما معک**'' میں باءعوض کیلئے نہیں ہے بلکہ سببیّت کیلئے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہارا نکاح اس کے ساتھ کردیا'' تم کو قرآن یاد ہونے کی وجہ سے''۔ (۳) قرآن کا مہر ہونا صرف ان صحابی کی خصوصیت تھی۔ ان کے بعد کسی دوسرے کے لئے قرآن کو مہر قرار دینا درست نہیں ہے۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے: **وأحلّ لم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم** (النساء پ۵) اس آیت میں صراحتاً بیان کیا گیا ہے کہ محرمات کے علاوہ باقی تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں کہ تم ان کو مال کے بدلہ حاصل کرسکتے ہو۔ مال کا ذکر بتلا رہا ہے کہ غیر مال مہر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**فنصف مافرضتم**'' اس میں طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کو آدھا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مہر میں تنصیف اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ وہ مال ہو۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔

کون العتق مهراً

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک...... عتق کو مہر بنانا جائز ہے۔

دلیل...... حضرت انسؓ کی حدیث ہے: ''**ان النبی ﷺ اعتق صفية رضی اللہ عنها وتزوّجها وجعل عتقها صداقها**'' (ترمذی) کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا پھر ان سے شادی کرلی اور ان کی آزادی کو ان کا مہر بنادیا۔ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ عتق کو مہر قرار دیا جاسکتا ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ امت کے لئے عتق کو مہر

بنانا درست نہیں ہے اور نکاح کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد خصوصیات ہیں جیسا کہ نو بیویوں سے شادی کرنا۔ بغیر مہر کے نکاح کرنا وغیرہ۔ اس لئے اگر کوئی (دوسرا) عتق کومہر بنائے گا تو نکاح تو ہو جائے گا مگر مہر مثل واجب ہوگا عتق مہر نہیں بنے گا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... عتق کومہر بنانا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے: ''**واتوا النساء صدقاتهن نحلةً فان طبن لكم عن شيء منه نفساً فكلوه هنيئاً مريئاً**'' (سورۃ النساء پ۴) اس آیت میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کے مقرر کردہ مہر ادا کرو اور اگر وہ خوشی سے کچھ مہر معاف کر دیں تو اس کو تم خوشگواری کے ساتھ کھاؤ۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اگر عتق کو مہر قرار دیا جائے تو اس میں سے کس طرح عورت معاف کر سکتی ہے اور شوہر اس کو کس طرح خوشگواری کے ساتھ کھا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ عتق مہر نہیں بن سکتا۔

خيار العتق

باندی کی عتق (آزادی) کے وقت اگر اس کا خاوند عبد (غلام) ہو تو باندی کو بالا تفاق خیارِ عتق حاصل ہوگا، لیکن اگر خاوند آزاد ہو، تو اس میں اختلاف ہے کہ خیارِ عتق حاصل ہوگا یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... دونوں صورتوں میں خیارِ عتق حاصل ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... اگر خاوند عبد ہو، تو خیارِ عتق حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔

منشاءِ اختلاف...... حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعۂ عتق ہے کہ ان کی آزادی کے وقت ان کا خاوند حضرت مغیث رضی اللہ عنہ آزاد تھا یا غلام؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق آزاد، جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کی تحقیق کے مطابق اس وقت یہ غلام تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے جس کو حضرت اسود رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: ''**انّ زوج بريدة كان حرًّا، حين أُعتقت**'' (ابوداؤد ج:۱، کتاب الطلاق، باب من قال کان حرًّا، ترمذی ج:۱، کتاب الرضاع) کہ بریرہؓ کی آزادی کے وقت اس کا خاوند آزاد تھا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کی دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس کو حضرت عروہ رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: ''**قالت كان زوج**

بریدة عبداً'' (ترمذی بحوالہ مذکور وابوداؤد)

جواب...... بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض نظر آتا ہے ایک میں زوج بریدہ رضی اللہ عنہا کی آزادی جبکہ دوسری میں ان کی غلامی کا ذکر ہے۔

اس تعارض کو رفع کرنے کے دوطریقے ہیں: طریقۂ تطبیق اور طریقۂ ترجیح۔

طریقۂ تطبیق...... یہ ہے کہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کی عبدیت مقدم تھی اور حریت بعد میں لاحق ہوئی (کیونکہ عبدیت حریت پر مقدم ہوا کرتی ہے ولاعکس) تو عبدیت کی روایت ماضی پر اور حریت کی روایت حال پر محمول ہے۔

طریقۂ ترجیح...... حریت کی روایت چند وجوہ سے راجح ہے۔(۱) اس روایت کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عروہ رحمہ اللہ، حضرت قاسم بن محمد رحمہ اللہ اور حضرت اسود رحمہ اللہ تینوں نقل کرتے ہیں۔ حضرت عروہ رحمہ اللہ سے حریت وعبدیت دونوں کی صحیح روایتیں مروی ہیں۔

حضرت قاسم رحمہ اللہ حریت والی روایت کو جزم کے ساتھ اور عبدیت والی روایت کو شک کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور حضرت اسود رحمہ اللہ صرف حریت والی روایت کو نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا حضرت اسود رحمہ اللہ کی روایت راجح ہے اس لئے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں جبکہ حضرت عروہ وقاسم رحمہما اللہ کی روایتوں میں باہم تعارض ہے۔(۲) حریت والی روایت نص ہے جبکہ عبدیت والی روایت محتمل ہے اور نص راجح ہے محتمل سے۔(۳) جمہور رحمہم اللہ کے مسلک میں ایک حدیث پر، جبکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک میں دونوں حدیثوں پر عمل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم۔

شهادة المرأة الواحدة فی الرضاع

زوجین کے درمیان رضاعت ثابت ہونے کے لئے کتنے گواہوں کی ضرورت ہوگی؟

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... اگر مرضعہ تنہا بھی کہہ دے کہ میں نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ اور ان کے مابین تفریق کردی جائے گی۔

دلیل...... حضرت عقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی کے درمیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مرضعہ کی گواہی پر ہی تفریق فرمادی تھی۔ (ترمذی کتاب الرضاع، بخاری

ج:۲،وابوداؤد والنسائی) جو کہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ تنہا مرضعہ کی گواہی رضاعت کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔

جواب......آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ان دونوں کو بدنامی سے بچانے کے لئے تھا، کہ ایک بات جب لوگوں کی زبان پر آ گئی ہے تو اس سے بچنا ہی بہتر ہے، اگر چہ وہ بات غلط ہی سہی۔

ائمہ ثلاثہ رحمھم اللہ فرماتے ہیں کہ......دودھ پلانے والی کو چونکہ دودھ پلانے کی اجرت ملتی ہے اس لئے صرف مرضعہ کا کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ میں نے اس کو دودھ پلایا ہے۔اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ اس پر میری اجرت واجب ہے، اور یہ مسئلہ معاملات کا ہے اور معاملات میں دو مردوں، یا ایک مرد، دو عورتوں کی گواہی ضروری ہوتی ہے، اس لئے یہاں بھی دو مردوں، یا ایک مرد، دو عورتوں کی گواہی ضروری ہوگی۔

دلیل......(۱)فان لم یکونا رجلین فرجل و امرأتان. (البقرۃ)اس آیت کریمہ میں نصاب شہادت کو بیان فرمایا، اور شہادت کی اس تعمیم میں رضاعت بھی شامل ہے۔(۲)عن عکرمة ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه اتی بامرأة شهدت علی رجل و امرأته انها ارضعتهما فقال لا حتّٰی یشهد رجلان اور رجل و امراتان (بیہقی وسنن سعید بن منصور)

تحقیقی بات......یہ ہے کہ اگر چہ قضاءً تنہا مرضعہ کے کہنے سے رضاعت ثابت نہیں ہوگی، مگر دیانتاً ثابت ہو جائے گی پس امام احمد رحمہ اللہ نے دیانتاً فتویٰ دیا اور ائمہ ثلاثہ نے گویا قضاء کا اعتبار کیا ہے۔

الرجوع عن الطلاق فی الحیض

حالت حیض میں بالاتفاق طلاق واقع ہو جاتی ہے۔البتہ آدمی گنہگار ہوتا ہے۔پھر اگر کسی نے حالت حیض میں طلاق دے دی تو اس کو رجعت کا حکم دیا گیا ہے۔مگر اس بارے میں اختلاف ہے کہ رجعت کرنا مستحب ہے یا واجب؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......رجعت کرنا مستحب ہے۔

دلیل......یہ ہے کہ جب نکاح کرنا واجب نہیں ہے تو اس کو باقی رکھنا بھی واجب نہیں ہوگا البتہ زیادہ سے زیادہ مستحب ہو سکتا ہے۔اس لئے ہم نے کہا کہ رجعت مستحب ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ قیاس مذکور کے مقابلے میں حدیث موجود ہے اس لئے حدیث راجح ہوگی۔ قیاس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... حالت حیض میں طلاق دینے کے بعد رجعت کرنا واجب ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو جب حالت حیض میں طلاق دیدی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیراجعھا'' کہ وہ (ابن عمر رضی اللہ عنہما) رجعت کرلے اور یہ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رجعت کرنا واجب ہے۔ دوسرے یہ کہ حالت حیض میں طلاق دینا بالاتفاق گناہ ہے۔ اب اس گناہ کو بالکل تو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ رجعت کر کے اس میں کمی کی جاسکتی ہے۔

النفقۃ و السکنیٰ

مطلّقہ رجعیہ اور مبتوتہ حاملہ کی طرح مبتوتہ غیر حاملہ کو دوران عدت نفقہ و سکنیٰ دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک...... مبتوتہ غیر حاملہ کو عدت کے دوران نفقہ اور سکنیٰ کچھ نہیں دیا جائے گا۔

دلیل...... حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیث ہے کہ جب ان کے شوہر نے ان کو طلاق دیدی تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''لا سکنیٰ لک و لا نفقۃ'' (ترمذی) کہ تیرے لئے نہ سکنیٰ ہے اور نہ نفقہ ہے۔ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام احمدؒ نے فرمایا کہ مبتوتہ غیر حاملہ کو نفقہ یا سکنیٰ کچھ نہیں دیا جائے گا۔

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... سکنیٰ دیا جائے گا لیکن نفقہ نہیں دیا جائے گا۔

دلیل...... سکنیٰ دینے کے سلسلہ میں یہ حضرات آیت کریمہ ''و اسکنوھن من حیث سکنتم'' الخ (سورۃ الطلاق پ ۲۸) سے استدلال کرتے ہیں جس میں سکنیٰ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور نفقہ نہ دینے کے سلسلہ میں حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نفقہ دینے سے انکار فرمایا ہے۔

جواب......(۱) حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مثلاً وہ اپنے شوہر اوران کے گھر والوں کے خلاف زبان درازی کیا کرتی تھیں اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سکنیٰ دینے سے انکار فرمادیا۔(۲) وہ تنہا رہنے کی وجہ سے وحشت محسوس کرتی تھیں اس لئے حضور اکرم ﷺ نے ان کو وہاں سے ہٹا کر حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر عدّت گزارنے کا حکم دیا، اور نفقہ نہ دیئے کا جواب یہ ہے کہ جب وہ اپنے شوہر کے گھر نہیں رہیں تو شوہر سے نفقہ بھی ساقط ہوگیا۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے دونوں چیزوں سے انکار فرمادیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......مبتوتہ غیر حاملہ کو نفقہ اور سکنیٰ دونوں چیزیں دی جائیں گی۔

دلیل......آیت کریمہ ہے:"والمطلّقٰت متاع بالمعروف حقاً علی المتّقین "اس آیت میں مطلقہ عورتوں کو متاع دینے کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اور متاع سے یہاں نفقہ اور سکنیٰ دونوں مراد ہیں، جیسا کہ اس سے پہلی والی آیت میں لفظ متاع سے بالاتفاق نفقہ اور سکنیٰ دونوں مراد لئے گئے ہیں۔

نیز حدیث میں ہے:"عن جابر رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال المطلقة ثلاثالها السکنیٰ والنفقة "(دارقطنی ص ۲۱ ج ۴) ان جیسی آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتوتہ غیر حاملہ کو سکنیٰ اور نفقہ دینا واجب اور ضروری ہے۔

کتاب البیوع

البیع قبل بدوّ الصلاح

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......بدو صلاح کے معنی یہ ہیں کہ پھل پک جائیں اور ان میں مٹھاس آجائے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک معنی یہ ہیں کہ پھل اس حالت پر پہنچ جائیں کہ آفت وفساد سے محفوظ ہوجائیں۔

بدو صلاح کی چھ صورتیں ہیں: تین صورتیں بدو صلاح سے پہلے پھل بیچنے کی ہیں اور تین بعد میں بیچنے کی ہیں۔ اولاً بدو صلاح سے پہلے بیع کی صورتیں ملاحظہ فرمالیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ بدو صلاح سے پہلے پھل بیچے جائیں اور بائع فوراً پھل توڑنے

کی شرط لگائے یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدوصلاح سے پہلے پھل بیچے جائیں اور مشتری کچھ مدت تک پھلوں کو درختوں پر چھوڑنے کی شرط لگائے۔ یہ صورت بالاتفاق ناجائز ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بدوصلاح سے پہلے پھل بیچے جائیں اور کوئی شرط نہ لگائی جائے، اس صورت میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... اس صورت میں بیع ناجائز ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے: ''نهى النبی ﷺ عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها نهى البائع والمشترى'' (شیخین) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدوصلاح سے پہلے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا ہے بائع کو بھی اور مشتری کو بھی۔

جواب...... تیسری صورت کے جائز نہ ہونے پر اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ انہوں نے پہلی صورت کو جائز کہا ہے جبکہ وہ بھی بدوصلاح سے پہلے بیع کی صورت ہے جو کہ حدیث مذکور کے خلاف ہے۔ تو جس طرح پہلی صورت حدیث کے عموم میں داخل نہیں ہوئی تیسری بھی داخل نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے بدوصلاح سے پہلے بیع سے بطور شفقت ومشورہ منع فرمایا ہے جس کو نہی ارشادی کہا جاتا ہے۔ (عینی: ۵/۳۹ و فتح القدیر: ۵/۱۰۲)

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... اس صورت میں بیع جائز ہے۔

دلیل...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''ان النبی ﷺ قال من باع نخلاً قد أبرّت فثمرتها للبائع الا ان يشترط المبتاع۔ (شیخین) کہ جو شخص ایسا کھجور کا درخت بیچے جس پر پھل ظاہر ہونے لگے ہوں تو پھل بائع کے ہوں گے الا یہ کہ مشتری شرط لگادے۔ ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں بدوصلاح سے پہلے بغیر کسی شرط کے بیع کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدوصلاح سے پہلے بیع کی یہ صورت جس میں کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو جائز ہے۔ دوسرے یہ کہ بدوصلاح سے پہلے اگرچہ مال متقوم نہیں ہے مگر تھوڑی ہی مدت میں عنقریب وہ مال متقوم بن جائے گا، اس لئے بھی بیع جائز ہونی چاہیے۔

بدوصلاح کے بعد بھی پھلوں کو بیچنے کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ بدوالصلاح کے بعد پھل بیچے جائیں اور فوراً پھلوں کو توڑنے کی شرط لگائی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدوصلاح کے بعد پھل بیچے جائیں اور پھلوں کو کچھ دن تک درختوں پر چھوڑنے کی شرط لگائی جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بدوصلاح کے بعد پھل بیچے جائیں اور کوئی شرط نہ لگائی جائے۔

بدوصلاح کے بعد بیع کی یہ تینوں صورتیں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک جائز ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دوسری صورت ناجائز ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... بدوصلاح کے بعد بیع کی ان تینوں صورتوں کے جواز پر اس حدیث کے مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں جس میں بدوصلاح سے پہلے بیع سے منع کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب بدوصلاح سے پہلے بیع ممنوع ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا بدوصلاح کے بعد مطلقاً جائز ہے (لیکن ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں ہے)۔

امام اعظم رحمہ اللہ...... دوسری صورت کے عدم جواز پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس میں مشتری کی جانب سے ایسی شرط لگائی گئی ہے جو متقضائے عقد کے خلاف ہے (یعنی ایک مدت تک پھلوں کو درختوں پر چھوڑے رکھنا) اور نبی کریم ﷺ نے بیع بالشرط سے منع فرمایا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع وشرط'' اس لئے دوسری صورت اس شرط فاسد کی وجہ سے جائز نہیں ہوگی۔

البیع بعد التأبیر

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... اگر کھجور کے درخت کو تابیر کے بعد بیچا جائے تو پھل بائع کے ہونگے اور اگر تابیر سے پہلے بیچا جائے تو پھل مشتری کے ہوں گے۔

دلیل...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''قال رسول اللہ ﷺ من ابتاع نخلاً بعد ان تؤبر فثمرتها للبائع الا ان یشترط المبتاع'' (مشکوۃ، ترمذی: ۱۲۴۴) اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ اگر کھجور کے درخت کو تابیر کے بعد بیچا جائے تو پھل بائع کے ہوں گے۔ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ اس کا

مفہوم مخالف نکالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تابیر سے پہلے بیچا جائے تو پھل مشتری کے ہوں گے گویا کہ وہ مفہوم مخالف کے ذریعہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر پھل تابیر سے پہلے بیچے جائیں گے تو مشتری کو ملیں گے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ مفہوم مخالف ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے۔ اس لئے اس کے ذریعہ قبل التابیر بیع کی صورت میں پھلوں کو مشتری کی ملکیت ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... کھجور کے درختوں کو تابیر کے بعد بیچا جائے یا تابیر سے پہلے، دونوں صورتوں میں پھل بائع کے ہوں گے۔

دلیل...... حدیث پاک میں ہے: ''عن النبی صلی الله علیه وسلم قال :من اشتری ارضافیها نخل فالثمرة للبائع الاان یشترط المبتاع ''(مشکوٰۃ) کہ جس نے کوئی زمین خریدی اوراس میں کھجور کا درخت بھی ہے تو پھل بائع کے ہوں گے۔ ملاحظہ فرمایئے اس میں تابیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق ارشاد فرمایا ہے کہ جب بھی درخت خریدے جائیں گے۔ پھل بائع کے ہوں گے یہی ہمارا مسلک ہے۔

خیار المجلس

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... عاقدین کو خیار مجلس حاصل ہوتا ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''المتبایعان کل واحد منهما بالخیار علی صاحبه مالم یتفرّقا''(بخاری ،ترمذی:۱۲۴۵) امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث میں خیار سے خیار مجلس اور تفرق سے تفرق بالابدان مراد لیتے ہوئے حدیث کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ عاقدین میں سے ہرایک کو اپنے ساتھی پر خیار مجلس حاصل ہے جب تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔

جواب...... یہ حدیث خبر واحد ہے، جو کہ آیت قرآنیہ کے مقابلے میں قابل قبول نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اس میں خیار سے خیار قبول مراد ہے خیار مجلس مراد نہیں ہے اور تفرق سے تفرق بالابدان مراد نہیں ہے بلکہ تفرق بالاقوال مراد ہے، یعنی بات چیت سے فارغ ہوجانا۔

امام اعظم ومالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... عاقدین کو خیار مجلس حاصل نہیں ہوتا۔

دلیل...... جب عاقدین کی جانب سے ایجاب وقبول ہوکر عقد تام ہوگیا تو اب اس کو پورا کرنا ضروری ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ''یا یھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود ''(سورۃ المائدہ پ۶)۔ ملاحظہ فرمایئے اس آیت میں عقد تام ہونے کے بعد اس کے ایفاء کو لازم قرار دیا گیا ہے اب اگر ہم خیار مجلس کو ثابت کریں تو اس ایفاء کے لازم ہونے کی نفی ہوجائے گی۔ اور مطلب یہ ہوجائے گا کہ عقد تام ہونے کے بعد ایفاء ضروری نہیں ہے بلکہ عاقدین کو اختیار ہے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث میں ہے: ''ان النبی ﷺ قال لا یحل له ان یفارق صاحبه خشیة ان یستقیله ''(ابوداؤد) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھی سے اس خوف سے جدا ہو کہ کہیں وہ مجھ سے اقالہ طلب نہ کرلے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر عاقدین کو اختیار رہتا تو ہر ایک بیع کو خود فسخ کرسکتا تھا۔ دوسرے سے اقالہ طلب کرنے کی کیا ضرورت تھی دوسرے سے اقالہ طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب کسی کو کوئی اختیار نہیں رہا ہے اس لئے بغیر دوسرے کی رضامندی سے بیع فسخ نہیں کرسکتا۔

بیع المصّراة

مصراة وہ جانور کہلاتا ہے جس کے تھنوں میں اس قصد سے دودھ روکا گیا ہوتا کہ خرید نے والا اس کو زیادہ دودھ کا جانور سمجھے۔ مصراۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... مشتری کو اختیار ہے، کہ اس کو رکھے یا ایک صاع تمر کے ساتھ اس کو واپس کردے۔

دلیل...... حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: ''ان النبی ﷺ قال من اشترىٰ شاة مصراة فهو بالخیار ثلثة ایام ان شاء ردها وصاعا من طعام ''(ترمذی) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسی بکری خریدے جس کا دودھ روک لیا گیا ہو تو اس کو اختیار ہے (چاہے اس کو رکھ لے اور) چاہے ایک صاع طعام کے ساتھ اس کو واپس کردے۔ ملاحظہ فرمایئے اس حدیث میں مشتری کو اختیار دیا گیا ہے رکھنے اور واپس کرنے کا۔

جواب...... یہ حدیث مضطرب ہے اس لئے استدلال کے قابل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ حدیث ''البیّعان بالخیار مالم یتفرقا '' سے منسوخ ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ آیت ربوا سے منسوخ ہے۔ تیسرے یہ کہ دودھ کے عوض ایک صاع تمر یا طعام دینا اصول کے خلاف ہے، کیونکہ ضمان میں یا تو مثل صوری دیا جاتا ہے یا مثل معنوی، اور یہاں تمر نہ مثل صوری (دودھ) ہے اور نہ مثل معنوی (دودھ کی قیمت) ہے یا یہ حکم دیانتاً ہے۔

امام اعظمؒ کے نزدیک...... مشتری کو رد کرنے کا اختیار نہیں بلکہ صرف رجوع بالنقصان کرے۔

دلیل...... ایجاب وقبول کے بعد جب عقد تام ہو چکا تو اب اس کو پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ''اوفوا بالعقود '' دوسرے یہ کہ حدیث میں ہے: ''الخراج بالضمان ''۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۴۹ ج ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کے قبضہ اور ذمہ داری میں چیز ہوتی ہے نفع اسی کا حق ہوتا ہے۔ چنانچہ جس وقت مشتری نے مصراۃ سے دودھ نکالا اس وقت وہ جانور مشتری کے قبضہ اور ذمہ داری میں تھا اس لئے یہ دودھ مشتری کے لئے ثابت ہوگا۔ اور جب یہ مشتری کا حق ٹھہرا تو اس کے عوض دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

حکم العاریة

عاریت...... کسی کو بغیر معاوضہ کے کسی چیز کے منافع کا مالک بنانا عاریت کہلاتا ہے۔ (ہدایہ ج:۳) چیز دینے والے (مالک) کو مُعیر، لینے والے مُستعیر اور اس کو مستعار یا عاریہ کہتے ہیں۔ اگر مستعیر کے ہاتھ میں عاریہ تعدّی کی وجہ سے ہلاک ہوجائے تو بالاتفاق ضمان لازم ہوگی، لیکن اگر بغیر تعدّی کے ہلاک ہوجائے تو آیا مستعیر پر ضمان لازم ہے یا نہیں۔

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... عاریت مطلقاً مضمون ہوتی ہے۔ تعدّی کی وجہ سے ہلاک ہو یا بغیر تعدّی کے۔ بالفاظِ دیگر، عاریت پر مستعیرؒ کا قبضہ، قبضہ ضمان ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ...... عاریت پر مستعیر کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے۔ تعدّی کی وجہ سے ہلاک ہو تو ضمان ہوگی، بغیر تعدی کے ہلاک ہو تو ضمان نہیں۔

دلیل امام شافعیؒ واحمدؒ...... حضرت ابوامامہؓ کی حدیث ہے: ''سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع ''العاریة

مؤدّاة ''الحدیث (ترمذی ج۱، ابواب البیوع باب ان العاریۃ مؤدّاۃ) کہ عاریت واجب الادا ہے اور ہر حال میں معیر کو لوٹانا ضروری ہے۔ (۲) حضرت صفوان بن امیہؓ کی روایت ہے: ''ان رسول اللہ ﷺ استعار منه ادراعاً یوم حنین، فقال: اَغصبٌ یا محمد؟فقال: لا، بل عاریة مضمونة '' (ابوداؤد ج:۲، کتاب الاجارۃ باب فی تضمین العاریۃ) کہ غزوۂ حنین کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اس (صفوانؓ) سے عاریتاً زرہیں مانگیں (اس وقت صفوان مسلمان نہیں تھے) تو صفوان نے کہا کہ اے محمد! کیا آپ یہ زرہیں غصب کرنا چاہتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، بلکہ عاریتاً لینا چاہتا ہوں، جس کی ضمان دی جائے گی۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً فرمایا کہ عاریت کے ضائع ہونے پر ضمان دی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عاریت مطلقاً مضمون ہوتی ہے تعدّی ہو یا نہ ہو۔

جواب...... (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کی تسلی کے لئے ضمان کا لفظ استعمال فرمایا۔ کیونکہ صفوان رضی اللہ عنہ اس وقت غیر مسلم تھے۔ (۲) اس حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مستعیر از خود ضمان ادا کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور اگر ادا نہ کرنا چاہے تو اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (بذل المجہود ج:۵)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی دلیل اور فریق ثانی کی دلیل اوّل سے جواب:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکورہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''العارية مؤدّاة '' کہ عاریہ چیز ادا کی جائے گی۔ ملاحظہ فرمائیے، آپ ﷺ نے ''ادا'' کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ جو ''تسليم عين ماوجب '' کو کہتے ہیں یعنی جو چیز مستعار لی ہے اس کا ''عین'' لوٹانا ''ادا'' کہلاتا ہے، اور اگر وہ چیز ہلاک ہوجائے تو اس کے بدل کو ''ادا'' نہیں کہتے بلکہ قضاء کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ''عین'' کا لوٹانا ممکن نہیں رہا۔ اس لئے یہ روایت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل ہے نہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی۔ (۲) حضرت صفوان بن یعلیؒ اپنے والد حضرت یعلیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ جب میرے قاصد تمہارے پاس آجائیں تو ان کو تیس زرہیں اور تیس اونٹ دیدینا، تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! أعارية مضمونة او عارية مؤدّاة؟ کیا یہ ایسی عاریت ہے جس کے ضائع

ہو جانے پر ضمان دی جائے گی، یا ایسی عاریت ہے کہ (اگر موجود ہو تو) اس کی ادائیگی کی جائے گی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بل عارية مؤدّاة'' بلکہ یہ ایسی عاریت ہے کہ اس کی ادائیگی کی جائے گی۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے ضمان کی نفی فرمائی۔

معلوم ہوا کہ عاریت مستعیر کے پاس امانت ہوتی ہے اور امانت کا حکم یہ ہے کہ اگر تعدی کی وجہ سے ہلاک ہو تو ضمان واجب ہوگی بغیر تعدّی کے ہلاک ہو، تو کوئی ضمان نہیں۔

مسئله الظفر بالدّين

مدیون اگر دائن کا دین (قرض) ادا نہ کرے اور مدیون کا کوئی مال دائن کے ہاتھ آ جائے تو کیا وہ اس سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

امام شافعیؒ کے نزدیک...... مدیون کے مال سے دائن کا اپنا حق وصول کرنا مطلقاً جائز ہے۔

امام احمد کے نزدیک...... مدیون کے مال سے دائن کا اپنا حق وصول کرنا مطلقاً ناجائز ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... مال اگر دین کی جنس سے ہو تو اپنا حق وصول کرنا جائز ہے اور غیر جنس سے ہو، تو ناجائز ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل...... قرآن پاک کی آیت کریمہ ہے: ''ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل''۔ (سورۃ البقرۃ)(٢) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''قال، قال النبی صلی الله علیه وسلم اد الامانة الىٰ من ائتمنك ولا تخن من خانك۔'' (ترمذی ج١، ابواب البیوع) کہ اس شخص کو امانت ادا کرو جس نے تمہارے پاس کوئی چیز امانت رکھی ہے اور جس شخص نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے۔ اس کے ساتھ خیانت مت کرو۔

ملاحظہ فرمائیے: اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیانت کے بدلے میں خیانت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

جواب...... چونکہ یہاں دائن اپنا حق وصول کر رہا ہے، اس لئے اس کو باطل نہیں کہہ سکتے اور حدیث میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ ندب پر محمول ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ ایسا نہ کرے۔ (تحفۃ الاحوذی ج:٢)

امام شافعیؒ کی دلیل......حضرت ہندہؓ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میرا شوہر (ابوسفیان) بخیل ہے، نفقہ صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتا، کیا میرے لئے جائز ہے کہ اس کے مال سے بقدرِ نفقہ کچھ لے لیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**خذی ما یکفیک وولدک بالمعروف**'' (ترمذی) کہ معروف طریقے پر جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے نفقہ کے لئے کافی ہو لے لیا کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دائن مدیون کے مال سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل......اتحادِ جنس کی صورۃ میں جواز کی دلیل ہندہ زوجہٗ ابوسفیانؓ کی مذکورہ بالا روایت ہے کہ ان کو آپ ﷺ نے ابوسفیانؓ کے مال سے نفقہ وصول کرنے کی اجازت دی تھی۔ یہاں نفقہ بھی نقد تھا اور مال بھی نقد تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس سے دین وصول کرنے کی اجازت دی۔ اور غیر جنس سے دَین وصول کرنا اس لئے جائز نہیں کہ اگر دین مثلاً نقد تھا اور کپڑے ہاتھ آ گئے، تو دائن کپڑوں کو بیچ کر ہی اپنا دَین وصول کرے گا اور کپڑوں کو مالک کی اجازت کے بغیر بیچنا غیر کے مال میں بلا اجازت تصرّف ہے جو کہ ناجائز ہے۔ نیز یہ بیع بھی درست نہیں۔ اس لئے غیر جنس سے دَین وصول کرنا ناجائز ہے۔

متأخرین احناف رحمہم اللہ......اس مسئلہ میں متأخرین احناف فقہاء رحمہم اللہ نے فتویٰ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر دیا ہے۔ (العرف الشذی والکوکب الدری)

بیع السَّلَم

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......بیع سلم میں مسلم فیہ (مبیعہ) کا ادھار ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر نقد موجود ہو تب بھی بیع سلم جائز ہے۔

دلیل......حدیث پاک میں ہے: ''**نھی النبی ﷺ عن بیع مالیس عند الانسان و رخص فی السلم**'' کہ نبی کریم ﷺ نے شئی معدوم کی بیع سے منع فرمایا ہے مگر بیع سلم میں رخصت مرحمت فرمائی ہے۔ اس حدیث میں بیع سلم کے بارے میں رخصت کی خبر دی گئی ہے کہ اگرچہ شئی معدوم کی بیع جائز نہیں ہے

مگر بیع سلم میں اجازت ہے کہ مبیعہ کے موجود نہ ہونے کے باوجود بھی بیع جائز اور صحیح ہو سکتی ہے۔اور جب مسلم فیہ کے ادھار اور غیر موجود ہونے کی صورت میں بیع صحیح ہو سکتی ہے تو نقد موجود ہونے کی صورت میں تو بدرجہ اولیٰ درست ہوگی۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے: ''لا تبع مالیس عندک'' کہ تو اس چیز کو مت بیچ جو تیرے پاس نہیں ہے۔اس کا تقاضہ یہ تھا کہ بیع سلم بھی صحیح نہ ہو کیونکہ اس میں بھی عقد کے وقت مبیعہ موجود نہیں ہوتی۔مگر حدیث صحیح اور درست قرار دی گئی ہے پس یہ ان شرائط کے ساتھ جائز ہوگی جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں چنانچہ جن احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے ان ہی سے یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ اس میں مبیعہ ادھار ہوگی اور اصطلاح میں اسی کا نام بیع سلم رکھا گیا ہے۔اس لئے کہ اگر مبیعہ بھی ثمن کی طرح نقد ہو جائے گی تو اس کا نام بیع سلم نہیں ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... مسلم فیہ کا ادھار ہونا ضروری ہے۔

دلیل...... حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے: ''ان النبی ﷺ قال من اسلف ای السلم فی شئی فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم'' (شیخین، ترمذی:۱۳۱۱) اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ جب تم بیع سلم کرو تو تین چیزوں کو متعین کرلو۔کیل، وزن اور مدت۔ملاحظہ فرمائیے اگر بیع سلم میں مبیعہ نقد ہوتی تو مدت متعین کرنے کا حکم کیوں دیا جاتا۔معلوم ہوا کہ سلم میں مبیعہ ادھار ہوتی ہے اسی لئے حکم دیا جا رہا ہے کہ سونپنے کے لئے مدت متعین کرلو۔اور یہی ہمارا مسلک ہے کہ بیع سلم میں مبیعہ ادھار ہوتی ہے۔

فائدہ...... بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے سات شرائط ہیں۔(۱)......راس المال (ثمن) کی جنس، نوع، وصف اور مقدار کو بیان کر دیا گیا ہو۔(۲)......راس المال نقد ہو۔(۳) مسلم فیہ (مبیعہ) کی جنس، نوع، وصف اور مقدار کو بیان کر دیا گیا ہو۔(۴)...... مسلم فیہ ادھار ہو۔(۵)......مبیعہ کو سونپنے کی جگہ متعین ہو۔(۶)......مبیعہ حاصل کرنے پر قدرت ہو۔(۷)...... مسلم فیہ ان چیزوں میں سے ہو جو متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہے۔

المتفرقات

الشفعة للجار

ائمہ رحمہم اللہ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ شریک کو شرکت کی بنا پر حق شفعہ حاصل ہو گا۔ مگر اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا جوار کی بنا پر شفعہ ملے گا یا نہیں؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... جوار کی بناء پر شفعہ نہیں ملے گا۔

دلیل...... حضرت جابرؓ کی حدیث ہے: ''**قال قضی النبی ﷺ بالشفعة فی کل مالم یقسم فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلاشفعة**'' (بخاری) کہ نبی کریم ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا حکم صادر فرمایا جس میں تقسیم نہ کی گئی ہو پس جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے پھر جائیں تو شفعہ نہیں ملے گا۔ ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں جار و جوار کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف شریک کا ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ جار (پڑوسی) کو شفعہ نہیں ملے گا۔

جواب...... یہ ہے کہ اس میں جو ''**فلاشفعة**'' کے ذریعہ شفعہ سے منع کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود اور راستے متعین ہونے کے بعد اب ''شرکت کی بنیاد پر'' شفعہ نہیں ملے گا، اس لئے کہ تقسیم کی وجہ شرکت ختم ہو گئی۔ رہا پڑوس کی بناء پر تو وہ باقی ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... شریک کی طرح جار بھی شفعہ کا حقدار ہے۔

دلیل...... حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: ''**الجار احق بسقبه**'' (بخاری، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) کہ پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**جار الدار احقّ بدار الجار**'' (ابوداؤد ۳۵۱۷) کہ پڑوسی پڑوسی کے گھر کا زیادہ حقدار ہے۔ ان تمام احادیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پڑوسی بھی شفعہ کا حقدار ہو گا اس لئے شفعہ کو صرف شریک فی نفس المبیع اور شریک فی حق المبیع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔

جرح العجماء جبار

اگر حیوان کسی شخص کو راستے میں چلتے ہوئے زخمی کر دے تو مالک پر اس کی دیت واجب ہو گی یا نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......اگر جانور نے دن میں کسی کو زخمی کیا ہے تو دیت واجب نہیں ہوگی۔اور اگر رات میں زخمی کیا ہے تو دیت واجب ہوگی۔

دلیل......امام شافعیؒ نے دن اور رات کے اس فرق کو ایک حدیث مرفوع سے اخذ کیا ہے: **عن البراء بن عازبؓ قال كانت لنا ناقة ضارية فد خلت حائطاً فافسدت فيه فكلم رسول الله ﷺ فيها فقضى ان حفظ الحوائط بالنهار على اهلها وان حفظ الماشية بالليل على اهلها** (ماخوذ از تقریر عثمانی) یعنی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اونٹنی نے کسی کے باغ میں داخل ہو کر کچھ نقصان کر دیا اور حضور اکرم ﷺ کے پاس یہ مسئلہ پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ باغوں کی دن میں حفاظت باغ والوں پر ہے اور جانوروں کی رات میں حفاظت جانوروں کے مالکوں پر ہے۔

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت میں جانوروں کے معاملات کا ذمہ داران کے مالکوں کو قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جانور رات میں کوئی نقصان کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس کے مالک پر ہوگی لیکن اگر دن میں نقصان کرے گا تو اس کی ذمہ داری مالک پر نہیں ہوگی۔ نیز امام شافعی رحمہ اللہ حدیث پاک: **العجماء جرحها جبار**، (جانوروں کا زخم معاف ہے) کو دن کے ساتھ خاص کرتے ہیں کہ دن میں جانوروں کا زخمی کرنا معاف ہے۔رات میں نہیں۔

جواب......(۱) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے حرام بن محیصہ نے روایت کیا ہے اور وہ مجہول ہیں۔(۲) حضرت براء رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔اور دوسری حدیث عام ہے اس لئے بغیر دلیل کے خاص نہیں کی جا سکتی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......اگر حیوان کے ساتھ سائق (ہانکنے والا) نہیں ہے تو ضمان نہیں آئے گا۔اور اگر سائق ہے اور اس کی غفلت کو اس میں دخل ہے تو ضمان آئے گا۔

دلیل......حدیث پاک: **جرحها جبار**، کا عموم حنفیہ کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں رات اور دن کی کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ مطلق کہا گیا ہے کہ جانوروں کے زخم پر کوئی ضمان نہیں ہے۔چنانچہ اس عموم کی بناء پر ہم نے رات اور دن میں ایک ہی حکم رکھا۔ [illegible] مالک ساتھ میں موجود ہے اور اس کی

غفلت کا اس نقصان میں دخل ہے تو اس پر ضمان آئے گا۔

فائدہ...... اس حدیث کے دوسرے اجزاء "**المعدن جبار**" اور "**وفی الرکاز الخمس**" کی تشریح سابق میں گزر چکی ہے اور "**والبئر جبار**" میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنی زمین میں یا مالک کی اجازت لے کر دوسرے کی زمین میں کنواں کھودا اور اس میں اگر کوئی مر گیا تو اس کھودنے والے پر کوئی ضمان نہیں آئے گا۔

قتل المؤمن بکافر

اس بات پر ائمہ رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کو کافر حربی کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کافر ذمی کے قصاص میں قتل کیا جائے گا یا نہیں؟

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... کافر حربی کی طرح کافر ذمی کے قصاص میں بھی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

دلیل...... حدیث پاک ہے: "**لا یقتل مسلم بکافر**" (بخاری) کہ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس حدیث میں حربی اور ذمی کی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لئے دونوں کا حکم ایک ہوگا کہ نہ کافر حربی کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا اور نہ کافر ذمی کے بدلہ میں۔

جواب...... یہ الفاظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن جو خطبہ دیا تھا، اس میں ارشاد فرمائے تھے۔ اور فتح مکہ تک ذمی کافر ہوتے ہی نہ تھے صرف حربی کافر ہوتے تھے۔ ذمی کافروں کا سلسلہ تو فتح مکہ کے بعد شروع ہوا ہے، معلوم ہوا کہ اس حدیث میں کافر سے حربی مراد ہے۔ ذمی کافر مراد نہیں ہے۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو حربی کافر کے بدلہ قتل نہیں کیا جائے گا۔

احناف رحمہم اللہ کے نزدیک...... حربی کافر کے قصاص میں مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: "**عن عبدالرحمن قال قتل النبی ﷺ مسلماً بمعاهد و قال انا احق من وفی بذمته**" (ابوداؤد) اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے: "**ان النبی ﷺ قتل مسلماً بمعاهد و قال انا اکرم من وفی بذمته**" (دارقطنی) ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمی کافر کے

قصاص میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ نیز جب اسلامی حکومت نے ان کے جان و مال کی، مسلمانوں کے جان و مال کی طرح ذمہ داری لے لی، تو دونوں اس حکم میں برابر ہو گئے، اس لئے دونوں کا ایک دوسرے سے قصاص لیا جائے گا۔

حدّ الزّنیٰ

اس مسئلے کے دو جزو ہیں:

(۱) غیر شادی شدہ مرد و عورت کی حد زنا کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ان کو جلا وطن بھی کیا جائے گا یا نہیں؟

امام شافعی و احمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... مرد و عورت دونوں کی حد سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔

دلیل...... حضرت عبادۃ بن الصامتؓ کی حدیث ہے: "**البکر بالبکر جلد مائة و نفی سنة**" اس حدیث میں علی الاطلاق مرد و عورت ہر ایک کے لئے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی بتلائی گئی ہے۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ و زید بن خالد جہنیؓ کی حدیث میں ہے: "**علی ابنک جلد مائة و تغریب عام**" (کتب ستہ) اس حدیث میں بھی کوڑوں کے ساتھ ایک سال کی جلا وطنی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں حد میں شامل ہیں۔

جواب...... (۱) جلا وطنی کو حد کا جز کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ جلا وطنی امام کی صوابدید پر ہے، اس کو حق ہے کہ وہ سیاستاً کر سکتا ہے۔ (۲) جس حدیث سے جلا وطنی ثابت ہوتی ہے وہ خبر واحد ہے، اور خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہو سکتی۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک...... مرد کی حد سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور عورت کی حد صرف سو کوڑے ہے۔ عورت کو جلا وطن نہیں کیا جائے گا۔

دلیل...... امام مالک رحمہ اللہ کے دلائل بھی وہی ہیں جو اوپر گزرے۔ لیکن وہ عورت کے بارے میں جلا وطنی کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ اگر اس کو تنہا جلا وطن کیا جائے گا تو اس میں اور فتنہ کا اندیشہ ہے، اور اگر شوہر کے ساتھ جلا وطن کیا جائے گا تو شوہر مجرم نہیں ہے اس کو بغیر کسی وجہ کے سزا دینا لازم آئے گا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... غیر شادی شدہ مرد و عورت کی حد صرف سو کوڑے ہیں۔

دلیل……آیت کریمہ ہے: ''الزانیة والزانی فاجلد واکل واحد منهما مائة جلدة '' (سورۃ النور) اس آیت میں صرف سوکوڑوں کا ذکر ہے، تغریب ونفی (جلاوطنی) کا ذکر نہیں ہے، اس لئے دونوں کی حد صرف سو کوڑے ہوگی اور جن احادیث سے جلاوطنی ثابت ہوتی ہے، وہ اس درجہ کی نہیں ہیں جن سے کتاب اللہ پر زیادتی ہوسکے۔ (۲) ثیب وثیبہ یعنی شادی شدہ مردوعورت کی حد میں بھی اختلاف ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک……شادی شدہ مردوعورت کی حد رجم اور سوکوڑے ہیں۔

دلیل……حدیث میں ہے: ''والثیب بالثیب جلد مائة والرجم '' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں شراحہ ہمدانیہ پر رجم کے ساتھ کوڑے بھی لگوائے تھے۔ معلوم ہوا کہ رجم کے ساتھ کوڑے بھی لگائے جائیں گے۔

جواب……یہ ہے کہ حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث حضرت ماعزا سلمی رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے منسوخ ہے۔ کیونکہ وہ بعد کا واقعہ ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک……شادی شدہ مردوعورت کی سزا صرف رجم ہے۔

دلیل……حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ ایک جماعت نے نقل کیا ہے مگر کسی نے بھی رجم کے ساتھ جلد مائۃ یعنی سوکوڑے کا تذکرہ نہیں کیا۔ اسی طرح غامدیہ کے بارے میں رجم کا ذکر ہے کوڑوں کا ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ثیب اور ثیبہ کی حد صرف رجم ہے۔

حدّ الخمر

خمر کی حقیقت

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک……خمر صرف انگور کی شراب کہلاتی ہے باقی دوسری نشہ آور چیزیں خمر کے حکم میں ہیں مگر ان پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا اس لئے کہ لغت میں خمر صرف انگور کی شراب کو کہا جاتا ہے اور ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک ہر نشہ آور شربت پر خمر کا اطلاق درست ہے: ''لقولہ علیہ السلام کل مکسر خمر'' یعنی آپ ﷺ کے ارشاد پاک (ہر نشہ آور چیز خمر ہے) کی وجہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ انگور کی شراب کے قلیل وکثیر کے حرام ہونے اور اس پر حد جاری ہونے کے قائل ہیں، مگر انگور کے علاوہ دوسری چیزوں کی شراب کے قلیل کی حرمت

کے تو قائل ہیں مگر اس پر حد جاری ہونے کے قائل نہیں ہیں۔اس کے برخلاف ائمہ ثلاثہؒ ہر نشہ آور چیز کے قلیل وکثیر کی حرمت اور اس پر حد جاری ہونے کے قائل ہیں۔

(پھر حد کے سلسلہ میں اختلاف ہے)

امام اعظمؒ و مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک..... شراب کی حد اسی کوڑے ہیں۔

دلیل...... اس مسئلہ میں ہماری دلیل حضرت عمرؓ کے دور مبارک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے جس کو حضرت ابن عبد البرؒ نقل کرتے ہیں: ''اتفق اجماع الصحابة في زمن عمر على الثمانين في حد الخمر ولا مخالف لهم '' کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں شراب کی حد کے اسی کوڑے ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہوا اور کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔معلوم ہوا کہ حد خمر اسی کوڑے ہیں۔چنانچہ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنے سے متعلق ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ''ان عمرؓ استشار علیاؓ فقال اری ان یجلد ثمانین '' کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے اسی کوڑوں کی ہے۔نیز بخاری شریف میں حضرت عبید اللہ بن عدی سے مروی ہے: ''انّ علیا رضی الله عنه جلده ثمانین '' ان تمام روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حد خمر اسی کوڑے ہیں۔

امام شافعیؒ کے نزدیک..... حد خمر چالیس کوڑے ہیں۔یہی ایک روایت امام احمدؒ کی ہے۔

دلیل...... حضرت انسؓ کی حدیث ہے: ''ان النبیﷺ کان یضرب فی الخمر بالنعال والجرید اربعین '' (مسلم ج۲، باب حد الخمر) کہ نبی کریم ﷺ خمر کی حد میں جوتی اور کھجور کی بغیر پتوں والی ٹہنی سے چالیس مرتبہ مارتے تھے۔نیز حضرت علیؓ نے جب ولید پر حد جاری کی تو چالیس کوڑے لگوائے اور فرمایا: ''جلد النبی ﷺ اربعین وابو بکر اربعین '' (حوالہ) کہ حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے چالیس کوڑے لگائے تھے۔معلوم ہوا کہ اصل میں حد خمر چالیس کوڑے ہی تھے (مگر بعد میں جب عیش وعشرت عام ہوئی اور شراب کی کثرت ہونے لگی تو حضرت عمرؓ کے دور میں صحابہ کرامؓ کے اجماع سے تعزیراً اس میں اضافہ کر دیا گیا)

جواب...... حدیث مذکور کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ مسلم (ج:۲، باب حد الخمر) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں: ''بجریدتین نحو اربعین'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوٹہنی سے چالیس لگوائے، چنانچہ ضرب کے اعتبار سے تو چالیس ہی رہے مگر آلہ کے اعتبار سے اسی (۸۰) ہوگئے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں امام طحاوی نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے دو کناروں والے کوڑے سے پٹوایا تھا۔ تو یہ بھی آلہ کے اعتبار سے اسی (۸۰) ہوگئے۔

نصاب حدّ السّرقة

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حد سرقہ کا نصاب کیا ہے؟ یعنی کم از کم کتنی مقدار مال چوری کرنے پر حد لگے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... حد سرقہ کا نصاب دس درہم یا ایک دینار ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... حد سرقہ کا نصاب ربع (چوتھائی) دینار ہے۔

امام اعظمؒ کی دلیل...... حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: ان النبی ﷺ قطع ید رجل فی مِجنّ قیمته دینار او عشرة دراهم (ابوداؤد ونسائی) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال (چوری کرنے) پر ایک آدمی کا ہاتھ کاٹا، جس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔ (۲) حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہؓ کی روایت ہے: کان ثمن المجنّ علی عهد رسول الله ﷺ عشرة دراهم (نسائی، دارقطنی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت دس درہم ہوتی تھی۔ نیز مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، طبرانی اوسط اور مصنف عبدالرزاق کی روایتوں میں بھی یہی (عشرة دراهم) کی مقدار ذکر ہے۔

امام مالکؒ کی دلیل...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: انّ رسول الله ﷺ قطع سارقا فی مجنّ قیمته ثلاثة دراهم۔ (شیخین) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال (کے چوری کرنے) پر ایک چور کا ہاتھ کاٹا تھا جس کی قیمت تین درہم تھی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: عن النبی ﷺ قال لا تقطع ید السارق الّا فی ربع دینار

فصاعدا (شیخین) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، مگر چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ (مال چوری کرنے) پر۔

وجہ ترجیح مذہب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ...... منشاء اختلاف یہ ہے کہ ایک ڈھال کے چوری کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع ید کی حد جاری کی ہے۔ اب اس ڈھال کی قیمت کیا تھی اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی قیمت دس درہم تھی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اس کی قیمت تین درہم تھی اور دوسری روایت میں ہے کہ اس کی قیمت ربع دینار تھی۔ اب حضرت ابن عباسؓ کی روایت اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں میں تعارض آ گیا۔ تو ہم نے دو وجہوں سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو ترجیح دی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت "ادراء للحد" ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اثر "لا قطع الّا فی دینار فصاعدا"۔ اس کے موافق ہے۔

الحدّ فی الحرم

اگر کسی شخص نے حرم کے اندر کوئی جنایت کی تو ائمہ کرام رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس پر حرم ہی میں حد جاری کی جاسکتی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حرم سے باہر (زمینِ حِل میں) جنایت کر کے پھر حرم میں داخل ہو جائے تو اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کو حرم کے اندر حد لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

امام شافعی و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... حرم میں حد لگانا جائز ہے خواہ اس نے حرم میں جنایت کی ہو یا حل میں جنایت کر کے پھر حرم میں داخل ہوا ہو۔

دلیل...... حضرت انسؓ کی حدیث ہے: "عن انسؓ جاء رجل وقال ان ابن خطل متعلق باستار الکعبة فقال اقتله" (شیخین) کہ ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ ابن خطل حرم میں آیا ہوا ہے اور کعبہ کے پردوں سے چمٹ رہا ہے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو قتل کر دو۔

دیکھئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم ہی میں ابن خطل پر حد جاری فرمائی، جبکہ اس نے باہر مسلمان کو قتل کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اگر حل میں جنایت کر کے کوئی حرم میں داخل ہو جائے تو اس پر حرم ہی میں حد جاری کی جاسکتی ہے۔

جواب...... ابن خطل کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کے قصاص میں قتل نہیں کروایا تھا۔

بلکہ اس کو مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کروایا تھا۔ اس لئے اس سے حرم میں حد قائم کرنا ثابت نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر حضور اکرم ﷺ نے اس کو قصاصاً قتل کروایا ہوتب بھی اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے لئے اس کی اجازت تھی چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**احل لی ساعة من نهار**'' (عینی:۵/۹۳) کہ حرم کو میرے لئے دن کی ایک گھڑی میں حلال کردیا گیا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... حل میں جنایت کرکے حرم میں داخل ہونے والے پر حرم میں حد جاری نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کو باہر نکلنے کی ترغیب دی جائے گی۔ اور اس سے کلام وغیرہ نہ کیا جائے گا۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث ہے: ''**ان النبی ﷺ قال ان هذا البلد حرمه الله يوم خلق السموت والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيٰمة**'' (شیخین) اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ حرم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے حرام کیا ہے اس لئے اس میں کوئی حد یا قصاص جاری نہیں کیا جائے گا۔ اور ایسے شخص سے کلام، بیع وغیرہ ترک کردینے کا حکم حضرت ابن عباسؓ کی ایک دوسری حدیث میں ملتا ہے: ''**عن ابن عباسؓ من اصاب حد اثم دخل الحرام لم يجالس ولم يبائع**'' (مصنف ابن ابی شیبہ)

اقسام اليمين واحكامها

یمین (قسم) کی تین قسمیں ہیں: لغو، غموس اور منعقدہ

اليمين اللّغو

یمین لغو کی تفسیر میں ائمہ کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک...... یمین لغو وہ یمین کہلاتی ہے جو بلا ارادہ لوگوں کی زبان پر کلام کے دوران ماضی، حال یا مستقبل سے متعلق آجاتی ہے۔ امام احمدؒ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔

دلیل...... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ یمین لغو کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''**هی ان يقول الرجل فی**

کلامہ لا واللہ بلی واللہ ''کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے کلام میں یہ کہے نہیں خدا کی قسم، ہاں خدا کی قسم (وغیرہ وغیرہ)

امام اعظم واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... یمین لغو یہ ہے کہ آدمی ماضی یا حال کی کسی بات کو اپنے گمان میں سچا سمجھتے ہوئے قسم کھائے۔ اور بعد میں وہ بات جھوٹی ثابت ہو جائے۔

دلیل...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: ''ھو الحلف علی یمین کاذبۃ و ھو یریٰ انہ صادق ''یعنی کسی جھوٹی بات پر قسم کھائی اور اپنے گمان میں یہ سمجھتا ہے کہ میں نے سچی بات پر قسم کھائی ہے۔ یمین لغو کہلاتی ہے۔

حکم...... یمین لغو کا حکم یہ ہے کہ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا اور وہ معاف ہے قرآن کریم میں ہے: ''لا یؤاخذ کم اللہ باللغو فی ایمانکم ''کہ اللہ تعالیٰ یمین لغو کے بارے میں تم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔

الیمین الغموس

دوسری قسم یمین غموس ہے، اور یمین غموس یہ ہے کہ آدمی زمانہ ماضی کے کسی فعل یا کسی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔ اس کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ اس میں کفارہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... یمین غموس میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔

دلیل...... یہ ہے کہ چونکہ اس قسم میں جھوٹ بولا جاتا ہے اور دل بھی اس کو جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے تو گویا دل ہی اس کا کسب کرتا ہے اور جس گناہ کا دل کسب کرتا ہے اور اس میں دل کے قصد کو دخل ہوتا ہے اس پر مؤاخذہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ''ولکن یؤاخذ کم بما کسبت قلوبکم ''کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں میں تم سے مؤاخذہ کرے گا جن کا تمہارے دلوں نے کسب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یمین غموس میں بھی مؤاخذہ ہوگا۔ اور مؤاخذہ سے یہاں کفارہ مراد ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اس قسم میں کفارہ واجب ہوگا۔

جواب...... یہ کہنا کہ یہاں مؤاخذہ سے کفارہ مراد ہے صحیح نہیں ہے بلکہ مؤاخذہ سے یہاں اخروی مؤاخذہ مراد ہے اور اس سے نجات کے لئے توبہ واستغفار کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لئے اس قسم میں توبہ واستغفار کیا جائے گا۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... یمین غموس میں کفارہ واجب نہیں ہے بلکہ صرف توبہ واستغفار ہے۔

دلیل...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ''**عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حلف علی یمین وھو فیھا اٰثم فاجر لیقطع بھا مالا لقی اللہ وھو علیہ غضبان** ''۔ اس حدیث میں یمین غموس کھانے والے کو صرف گنہگار بتلایا ہے، لیکن اس پر کفارہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ اگر کفارہ واجب ہوتا تو ضرور اس کو ذکر کرتے۔ معلوم ہوا کہ یمین غموس میں کفارہ واجب نہیں ہے۔

الیمین المنعقدہ

تیسری قسم یمین منعقدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زمانہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے۔ پس اگر اس نے اپنی قسم کو پورا کیا تو صحیح ہے ورنہ بالاتفاق کفارہ واجب ہوگا اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے یا تین دن تک روزے رکھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یمین منعقدہ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ماتطعمون اھلیکم او کسوتھم اوتحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام**''۔ (سورۃ المائدہ پ ۷)

الکفارۃ قبل الحنث

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک...... قسم کھانے کے بعد حانث ہونے سے پہلے ہی کفارہ دینا جائز ہے۔

دلیل...... (۱) قرآن کریم میں ہے: ''**ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین** '' اس آیت میں قسم کھانے کے بعد بس کفارہ کو بیان کیا گیا، حانث ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حانث ہونے سے پہلے ہی کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں ہے: ''**ذالک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم** '' اس آیت میں بھی قسم کا ذکر ہے اور کفارے کا ذکر ہے حانث ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (۲) حضرت

ابو موسیٰؓ سے مروی ہے: "ان النبی ﷺ قال انی واللہ لا حلف علی یمین فاری غیرھا خیرا منھا الا کفّرت عن یمینی فاتیت الذی ھو خیر "نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! میں جب بھی کسی کام پر قسم کھاتا ہوں پھر اس سے بہتر دوسری چیز دیکھتا ہوں تو اپنی قسم کا کفارہ دیتا ہوں اور دوسری چیز جو بہتر ہے اس کو اختیار کرتا ہوں۔ اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی قسم کا پہلے کفارہ دینے کو ذکر فرمایا، بعد میں اس کام کو ذکر کیا جس سے حانث ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ حانث ہونے سے پہلے کفارہ دینا جائز ہے۔

جواب...... آیات کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں "بما عقدتم الایمان" کے بعد اور دوسری آیت میں "اذا حلفتم" کے بعد "وحنثم فیھا" محذوف ہے، اور حدیث کا۔

جواب...... یہ ہے کہ مسلم شریف میں ایک روایت ہے جو کہ اس کے بالکل برعکس ہے: "ان النبی ﷺ قال من حلف علی یمین فرأی غیر ھا خیر امنھا فلیأت الذی ھو خیر ولیکفّر عن یمینه" کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں قسم کھالے پھر اس سے بہتر چیز پالے تو اس کو چاہئے کہ بہتر کو اختیار کرے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے۔

ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں حانث ہوجانے کے بعد کفارہ کا ذکر ہے جو کہ پہلی حدیث کے بالکل برعکس ہے۔ اور تعارض کے وقت اس حدیث پر عمل کیا جاتا ہے جو قیاس کے موافق ہو۔ اور قیاس یہی کہتا ہے کہ کفارہ قبل الحنث درست نہیں ہے اس لئے کہ حانث ہونا ایک جنایت ہے، جس کا کفارہ دیا جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی نے ابھی جنایت ہی نہیں کی اور حانث نہیں ہوا تو کفارہ بعد الحنث ادا کیا جائے گا، قبل الحنث ادا نہیں کیا جائے گا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک...... حانث ہونے سے پہلے کفارہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

دلیل...... حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: "ان النبی ﷺ قال یا عبدالرحمن اذا حلفت علی یمین فرأیت غیرھا خیر امنھا فأت الذی ھو خیر وکفّر یمینک "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمٰن! جب تو کسی چیز کے بارے میں قسم کھائے پھر اس سے بہتر کوئی دوسری چیز دیکھے تو بہتر کو اختیار کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے۔ ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں پہلے حانث ہونے کا حکم دیا گیا ہے

پھر کفارہ کا۔معلوم ہوا کہ کفارہ بعدالحنث ہے،قبل الحنث جائز نہیں ہے۔

سهم الفارس

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک......راجل (پیدل لڑنے والے) کے لئے ایک حصہ ہے اور فارس (یعنی گھوڑسوار) کے لئے تین حصے ہیں۔ایک سوار کا اور دو اس کے گھوڑے کے۔

دلیل......حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ہے:''**ان النبی ﷺ اسهم للرجل ولفرسه ثلاثة اسهم سهماله وسهمين لفرسه** ''(شیخین) کہ حضور اکرم ﷺ نے آدمی اور اس کے گھوڑے کے لئے تین حصے مقرر فرمائے ہیں۔اور ایک دوسری روایت میں ہے:''**ان النبی ﷺ اسهم للفارس من ثلثة اسهم وللراجل سهما** ''ان جیسی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ راجل کو ایک حصہ ملے گا اور فارس کو تین حصے ملیں گے۔ایک اس کا اور دو اس کے گھوڑے کے۔

جواب......(۱) یہ احادیث غزوۂ خیبر سے پہلے کی ہیں اس لئے منسوخ ہیں۔(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نفل وعطیہ ایک حصہ زائد عنایت فرمایا ہوگا۔جیسا کہ حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کو عطا فرمایا تھا۔(۳) کبھی کتابت میں الف کو حذف کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ اصل میں ''**للفارس سهمان** ''تھا الف حذف ہوگیا تو'' **للفرس سهمان**'' ہوگیا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......راجل کو ایک حصہ اور فارس کو دو حصے دیئے جائیں گے۔

دلیل......حضرت مجمع بن جاریہ انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:''**فقسمت خيبر على اهل الحديبية على ثمانية عشر سهما فاعطى الفارس سهمين واعطى الراجل سهما** ''(مشکوۃ ج۲) کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کے مال کے اٹھارہ حصے کرکے اہل حدیبیہ پر تقسیم فرمائیے پس فارس کو دو حصے دیئے اور راجل کو ایک حصہ عنایت فرمایا۔ملاحظہ فرمائیے اس حدیث میں صاف بتلایا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے گھوڑسوار کو دو حصے دیئے،یعنی ایک اس کا حصہ اور ایک گھوڑے کا۔پھر احادیث میں تعارض کے وقت قیاس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ گھوڑے کا ایک حصہ ہونا چاہئے،اس لئے کہ گھوڑا تابع ہے اور سوار اصل ہے،تو اگر

گھوڑے کو دو حصے دیئے جائیں اور سوار کو صرف ایک حصہ دیا جائے، تو تابع اصل پر بڑھ جاتا ہے۔ جو کہ عقل کے خلاف ہے۔

سلب القتیل

اگر امیر قتال سے پہلے یہ اعلان کر دے کہ مقتول کا سامان قاتل کو دیا جائے گا تو بالاتفاق قاتل سلب کا مستحق ہوگا۔ اور اگر امیر یہ اعلان نہ کرے تو اس صورت میں اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک...... امیر خواہ اعلان کرے یا نہ کرے سلب قاتل کو دیا جائے گا۔

دلیل...... حدیث نبوی ہے: ''من قتل قتیلا فلہ سلبہ '' کہ مقتول کا سامان اس شخص کے لئے ہے جس نے اس کو قتل کیا ہے۔ اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً ارشاد فرمایا ہے کہ مقتول کا مال وزر قاتل کو ملے گا۔ امیر کے اعلان کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔

جواب...... یہ ہے کہ حدیث مطلق ہے، اور جب مطلق اور مقید ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو مطلق کو بھی مقید پر محمول کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو بھی پہلی صورت (یعنی امیر پہلے ہی اعلان کر دے) پر محمول کیا جائے گا۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... اگر امیر پہلے اعلان کر دے تو قاتل مقتول کے مال کا مستحق ہوگا ورنہ نہیں۔

دلیل...... آیت کریمہ ہے: ''واعلموا انما غنمتم من شیء فان اللہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین وابن السبیل الخ '' (سورۃ الانفال پ۱۰) اس آیت میں شیٔ کو نکرہ لا کر ہر مال کو غنیمت میں شامل کرتے ہوئے غانمین کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور سلب القتیل بھی شیٔ میں داخل ہے، اس لئے وہ قاتل کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟ دوسری آیت میں غانمین کے لئے ارشاد ہے: ''فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً '' کہ کھاؤ تم اس مال میں سے جو تم کو غنیمت میں ملا ہے حلال اور پاکیزہ۔ اور سلب بھی غنیمت کے طور پر حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ بھی غانمین پر تقسیم ہوگی حضرت حبیب بن مسلمہؓ نے ایک جہاد میں کافر کو قتل کر کے اس کے مال پر قبضہ کر لیا اور اس کو یہ کہہ کر لینا چاہا کہ حضور اکرم ﷺ نے مقتول کے مال کا قاتل کو مستحق

قرار دیا ہے اس پر حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا: ''مھلا یا حبیب لان النبی ﷺ قال انما للمرء ماطابت به نفس امامه ''۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر خوشی سے نہ دے اور پہلے اعلان نہ کرے تو سلب قاتل کو نہیں ملے گا۔

ذوی القربیٰ

مال غنیمت کے پانچ حصے کئے جاتے تھے۔ ایک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حصہ، دوسرا حضور اکرم ﷺ کے رشتہ داروں (بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب) کا حصہ، تیسرا یتامیٰ کا، چوتھا مساکین کا حصہ اور پانچواں ابن السبیل (مسافر) کا حصہ۔ ان پانچ حصوں میں سے پہلے دو حصے حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ساقط ہو گئے۔ ایک حضور اکرم ﷺ کا حصہ اور دوسرا آپ ﷺ کے رشتہ داروں کا وہ حصہ جو ان کو بطور نصرت دیا جاتا تھا البتہ آپ ﷺ کے رشتہ داروں میں جو فقراء ہیں ان کو باقی تین قسموں یتامیٰ مساکین اور ابن السبیل میں شامل کر کے حصہ دیا جائے گا۔ یہ ساری تفصیل اجماعی ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ فقراء ذوی القربیٰ کی طرح حضور اکرم ﷺ کے ذوی القربیٰ کے جو اغنیاء ہیں ان کو حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ میں سے فقراء کی طرح اغنیاء کو بھی حصہ دیا جائے گا۔

دلیل ..... آیت کریمہ میں: ''ولذی القربیٰ ''مطلق وارد ہوا ہے۔ اس میں فقیر اور غنی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس لئے جس طرح فقراء بنو ہاشم وبنو عبد المطلب کو دیا جائے گا اسی طرح ان کے اغنیاء کو بھی دیا جائے گا۔

جواب ..... یہ ہے کہ آیت کریمہ میں جو لفظ ''ولذی القربیٰ '' وارد ہوا ہے وہ بالاتفاق عام نہیں ہے۔ ورنہ تو تمام لوگوں کے ذوی القربی خمس میں حصہ کے حقدار ہو جائیں گے۔ بلکہ مجمل ہے اور اس کے لئے بیان کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا اغنیاء کو چھوڑ کر فقراء کو حصہ دینا، اس کے لئے بیان ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فقراء ذوی القربیٰ کو حصہ دیا جائے گا، اغنیاء ذوی القربیٰ کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

احناف رحمہم اللہ ..... کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں میں سے فقراء کو حصہ دیا جائے گا اور اغنیاء کو نہیں دیا جائے گا۔

اکل الضّبّ

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک......ضبّ (گوہ) حلال ہے۔

دلیل......حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: "**ان النبی ﷺ سُئل عن اکل الضّبّ فقال لآ اٰکلهُ ولا احرّمه**" (ترمذی کتاب الاطعمۃ، باب اکل الضّب) نیز حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: "**اُکِلَ الضبّ علیٰ مائدة رسول الله ﷺ وفیهم ابو بکر رضی الله عنه**" ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضب (گوہ) حلال ہے۔

جواب......ضب کے بارے میں بھی احادیث متعارض ہیں اس لئے حرمت والی احادیث کو ترجیح حاصل ہوگی۔ نیز اس کی حلت آیت "**ویحرم علیهم الخبائث**" سے پہلے تھی۔ بعد میں منسوخ ہوگئی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک......ضب مکروہ تحریمی ہے۔ فقہاء اسی کے قائل ہیں البتہ محدثین احناف مکروہ تنزیہی کے قائل ہیں۔

دلیل......آیت کریمہ ہے: "**ویحرّم علیهم الخبائث**" (سورۃ الاعراف پ۹) اور گوہ بھی خبائث میں سے ہے۔ اس لئے حلال نہ ہوگی۔ (۲) حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رحمہ اللہ کی روایت ہے: "**انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن اکل لحم الضب**"۔ (ابوداؤد کتاب الاطعمہ، باب فی اکل الضب)

ملاحظہ فرمائیے۔ اس حدیث میں گوہ کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ نیز ایک مرتبہ آپ کے پاس گوہ لائی گئی تو آپ ﷺ نے اس کی انگلیاں شمار کیں۔ اور فرمایا کہ بنی اسرائیل کی ایک قوم کو مسخ کیا گیا تھا شاید کہ وہ یہی ہے اور آپ ﷺ نے اس کے کھانے سے انکار فرمادیا۔ (بحوالۂ مذکور)

اکل الضّبع

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک......ضبع (بجّو) حلال ہے۔

دلیل......حضرت ابن ابی عمارۃؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے دریافت کیا کہ کیا بجّو شکار ہے، انہوں نے جواب دیا ہاں۔ میں نے کہا کہ کیا میں اس کو کھا سکتا ہوں انہوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کیا یہ رسول اللہ

علیہ وسلم ﷺ نے فرمایا ہے۔انہوں نے کہا ہاں۔(ترمذی)

جواب...... یہاں بھی اباحت اور حرمت کی احادیث میں تعارض ہے، اس لئے حرمت والی احادیث کو ترجیح دی جائے گی۔

امام اعظم و مالک رحمہما اللہ کے نزدیک...... ضبع (بجو) کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔**دلیل**...... آیت کریمہ:"**ویحرم علیهم الخبائث**"(الاعراف:پ۹) نیز حضرت علیؓ سے مروی ہے:"**ان النبی** ﷺ **نهی عن اکل الضب والضبع**"(حاشیہ ترمذی) یعنی نبی کریم ﷺ نے ضب اور ضبع کے کھانے سے منع فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ مذکورہ دونوں چیزیں حلال نہیں ہیں۔

لحوم الخیل

امام شافعی واحمد رحمہما اللہ کے نزدیک...... گھوڑے کا گوشت مباح ہے۔**دلیل**...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:"**ان النبی** ﷺ **نهی عن لحوم الحمر الاهلية واذن فی لحوم الخیل یوم خیبر**"۔اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ غزوہ خیبر کے دن لحوم خیل کی اجازت دی گئی تھی۔اس لئے وہ مباح ہوگا۔**جواب**......(۱) یہ حدیث آیت کے معارض ہے اس لئے آیت کے مقابلہ میں حجت نہیں بن سکتی۔(۲) تعارض کے وقت مبیح کے مقابلہ میں محرّم کو ترجیح ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک...... گھوڑے کا گوشت مکروہ ہے۔**دلیل**...... آیت کریمہ ہے:"**والخیل والبغال والحمیر لترکبوها وزینة**"(سورۃ النحل) اس آیت میں گھوڑے کی تخلیق کو سواری اور زینت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔معلوم ہوا کہ گھوڑا کھانے کے لئے نہیں ہے۔نیز حدیث میں ہے:"**عن خالدبن الولید رضی الله عنه ان النبی** ﷺ **نهی عن لحوم الخیل والبغال والحمیر**"(ابن ماجہ) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے، خچر اور گدھے کے گوشت سے منع فرمایا ہے۔

ذکوٰۃ الجنین

اگر جنین (وہ بچہ جو ابھی جانور کے پیٹ میں ہے) زندہ نکل آئے تو ماں کے ساتھ اس کو ذبح کرنا واجب ہے۔البتہ اگر مردہ نکلے اور مکمل بھی ہو تو اس میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک...... ایسا مردہ بچہ حلال ہے، اور اس کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کی ماں کو ذبح کر دینا کافی ہے۔**دلیل**...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:"**ان النبی** ﷺ **قال ذکوٰۃ الجنین ذکوٰۃ امه**"(ترمذی:۱۴۷۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بچہ کو ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔یعنی اگر ماں کو ذبح کر دیا تو سمجھو کہ بچہ بھی ذبح ہو گیا، الگ سے بچہ کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔**جواب**...... یہ ہے کہ اس حدیث میں نیابت مراد نہیں ہے۔یعنی حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ماں کا ذبح کرنا جنین کے ذبح کرنے کے قائم مقام ہے، اس لئے الگ سے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔بلکہ یہ حدیث زندہ جنین سے متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر

بچہ زندہ نکل آئے تو اس کو اسی طرح ذبح کیا جائے گا جس طرح اس کی ماں کو۔ یعنی عبارت اس طرح ہوگی: "ذکوٰۃ الجنین کذکوۃ امہ" نیز یہ خبر واحد ہے۔ اس لئے آیت کے مقابل نہیں بن سکتی۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک..... اگر جنین مردہ نکلے تو وہ حرام ہے۔ اس لئے اس کو یا اس کی ماں کو ذبح کرنے سے وہ حلال نہیں ہوگا۔ **دلیل**..... قرآن کریم کی آیت ہے: "**حرمت علیکم المیتۃ الخ**" اس لئے مردہ بچہ بھی حرام ہوگا۔ نیز اسی آیت میں آگے **منخنقۃ** (یعنی وہ جانور جس کا دم گھٹ گیا ہو) جانور کو بھی حرام بتلایا گیا ہے اور بچہ بھی ماں کے ذبح کرنے کے بعد سانس نہ پہنچنے کی وجہ سے دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو **منخنقۃ** کا ہے۔ یعنی ایسا جنین حرام ہوگا۔

الفخذ عورۃ

کیا ران (ٹانگ کا شروع والا حصہ) چھپانے کی جگہوں میں داخل ہے یا نہیں؟

داؤد ظاہری رحمہ اللہ کے نزدیک..... ران عورت (چھپانے کی چیز) نہیں ہے یہی ایک روایت امام احمد رحمہ اللہ کی ہے۔ **دلیل**..... حدیث انسؓ جس میں غزوہ خیبر میں حضور اکرم ﷺ کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "**ثم حسر الازار عن فخذہ حتی انی انظر الی بیاض فخذ النبی** ﷺ" (بخاری) کہ حضور اکرم ﷺ کی ران سے کپڑا کھسک گیا یہاں تک کہ مجھے آپ ﷺ کی ران کی سفیدی دکھائی دینے لگی۔ اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ کی ران سے کپڑا کے کھسک جانے کا ذکر ہے ظاہر یہ اسی سے ران کا عورت نہ ہونا ثابت کرتے ہیں۔ جواب..... یہ ہے کہ جنگ میں ہجوم بہت زیادہ ہوتا ہے اور مختلف قسم کی سرگرمیاں ہوتی ہیں جیسے کسی کو دوڑ کر مارنا گھوڑے پر تیزی سے چڑھنا وغیرہ وغیرہ تو اگر ایسی کسی حالت میں غیر اختیاری طور پر ران وغیرہ سے کپڑا ہٹ جائے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ پردے کی جگہ نہیں ہے آپ ﷺ کی ران سے بالیقین غیر اختیاری طور پر کپڑا ہلکا سا کھسک گیا ہوگا نہ یہ کہ آپ ﷺ نے نعوذ باللہ عمداً ایسا کیا ہو۔ اس لئے آپ ﷺ کے اس واقعہ سے فخذ کو غیر عورت ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے نزدیک..... فخذ عورت ہے۔ **دلیل**..... حضرت جرہدؓ کی حدیث کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "**اما علمت ان الفخذ عورۃ**" (ترمذی وابوداؤد ج:۲، کتاب الحمام، باب النھی عن التعری) اسی طرح حضرت علیؓ سے مروی ہے: "**ان النبی** ﷺ **قال یا علی! لا تکشف فخذک ولا تنظر الی فخذ حیّ ولا میت**" (ابوداؤد بحوالہ مذکور) ملاحظہ فرمائیے پہلی حدیث میں صاف طور سے فخذ کا عورت ہونا بتلایا گیا ہے اور دوسری حدیث میں حضرت علیؓ کو ران نہ کھولنے اور کسی زندہ یا مردہ کی ران کو نہ دیکھنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فخذ (ران) ستر میں داخل ہے اور اس کو کھولنا یا دوسرے کی ران دیکھنا بغیر عذر شرعی کے جائز نہیں ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین